تفسیر سورة ق

ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ

ادارۃ العلوم الاثریہ
فیصل آباد

تفسیر سورۃ ق
ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ
ادارۃ العلوم الاثریۃ
فیصل آباد

نام کتاب: تفسیر سورۃ قٓ

مولف: ارشاد الحق اثری

ناشر: ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار فیصل آباد۔

فون:041-2642724

تعداد: 1000

تاریخ طباعت: جنوری 2010ء

مطبع: انٹرنیشنل دار السلام پرنٹنگ پریس، لاہور

فون:042-7232400

ملنے کا پتہ

(1) ادارۃ العلوم الاثریہ، منٹگمری بازار فیصل آباد۔فون:041-2642724

(2) مکتبہ اسلامیہ: (A) غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور
(B) کوتوالی روڈ فیصل آباد۔فون:041-2631204

LIBRARY
3
Lahore
Islamic
University
Book No.
91 Babar Block, Garden Town, Lahore

فہرس

آیت نمبر 3

آیت نمبر 4

آیت نمبر 5

آیت نمبر 6

آیت نمبر 7، 8

آیت نمبر 9-11

آیت نمبر 12-14

آیت نمبر 20

آیت نمبر 21

آیت نمبر 22

آیت نمبر 23-25

آیت نمبر 26

آیت نمبر 27-29

آیت نمبر 30

آیت نمبر 31

آیت نمبر 32

آیت نمبر 33

آیت نمبر 34

آیت نمبر 35

آیت نمبر 36، 37

آیت نمبر 38-40

آیت نمبر 41-44

آیت نمبر 45

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے آخری صحیفہ ہے، یہ نسخۂ شفاء ہے، مگر ان کے لیے جو اس کو عمل میں لائیں اور اسے حرزِ جان بنائیں۔ یہ حریر وریشم میں لپیٹ کر طاقوں میں سجانے کے لیے نہیں، بلکہ اس کی تلاوت سے حلاوت پانے، آنکھوں کو پرنم کرنے، اس پر غور وفکر کرنے اور اسے دستور العمل بنانے کے لیے ہے۔ یہ انسان کو انسانیت سکھانے اور انھیں ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے ہے۔ یہ بتلاتا ہے کہ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں۔ تم یہاں شتر بے مہار نہیں ہو، بلکہ تمھارا ایک مالک اور خالق ہے اور تمھارے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے، اور وہ یہ کہ اپنے مالک کو پہنچانو اس کی بندگی کرو، اپنے آپ کو اس کے سپرد کردو۔ گویا تم اس کا مصداق بن جاؤ کہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا گیا کہ اپنے رب کے ہوجاؤ تو انھوں نے کہا: میں رب العالمین کا ہوگیا۔ (البقرۃ: ۱۳۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اعلان کروایا کہ کہیے میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے۔ (الانعام: ۱۶۲) یہ جذبۂ صادقہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ بندگی کے کیا کیا تقاضے اور ایک بندے کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اس کا جواب قرآن نے دیا ہے۔ اور اس کا علم تبھی ہوسکتا ہے جب قرآن کو پڑھا اور سمجھا جائے خود قرآن مجید نے بار بار عقل وبصیرت سے کام لینے اور غور وفکر کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ قرآن سے محبت کرنے اور اسے سمجھنے، سمجھانے کا داعیہ رکھنے والوں کی خدمت میں اسی مقصد کے لیے سورۂ ق کی تفسیر وتعبیر پیش کی جارہی ہے۔ یہ تفسیر دراصل راقم کے ان خطبات پر مشتمل ہے جو جامع مسجد مبارک اہلحدیث،

منٹگمری بازار میں ایک عرصہ پہلے دیئے گئے، جنھیں ضروری حک واضافہ سے استفادۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ خطبات اور تفسیر کے لیے اس سورت کو کیوں منتخب کیا گیا؟ اس کا جواب آپ کلمۂ افتتاحیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مجھے امید ہے کہ علمائے کرام، خطبائے عظام بھی اس اہم سورت کو اپنے خطبات اور دروس کا موضوع بنائیں گے اور یوں اپنی تبلیغی خدمات میں میرے لیے اور میرے والدین، اساتذۂ کرام اور تمام رفقائے ادارہ کے لیے صدقۂ جاریہ کا باعث بنیں گے۔ ان شاء اللہ۔

میں اپنے رفقائے کرام کا بے حد ممنون ہوں جو بہر نوع ادارہ کی سرپرستی کرتے ہیں اور اس شجرۂ طیبہ کی آبیاری میں کسی لحاظ سے پیچھے نہیں رہتے۔ اسی طرح ادارہ کے رفقاء مولانا عبد الحی انصاری، مولانا طارق محمود ثاقب، قاری محمد بشیر، مولانا حافظ محمد خبیب احمد، حافظ محمد ارشاد حفظہ اللہ کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے یمین و یسار ہیں اور اپنے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سب کی مساعیِ حسنہ کو قبول فرمائے اور ہم سب کے لیے اپنی رضا کے کام آسان فرمائے۔ آمین

خادم العلم والعلماء

ارشاد الحق اثری عفی عنہ

۸ محرم الحرام: ۱۴۳۰ھ

۷ جنوری: ۲۰۰۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کلمۂ افتتاحیہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين وعلى اله وصحبه أجمعين، أما بعد:

سورۂ قٓ پنتالیس آیاتِ مبارکہ پر مشتمل ہے، قرآنِ مجید کی جو سات منزلیں ہیں، ان میں ساتویں منزل کا آغاز اسی سورۂ قٓ سے ہوتا ہے۔ حضرت اوس بن حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ میں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا: كيف تحزبون القرآن کہ آپ قرآنِ پاک کا ورد یا منزلیں کس طرح کرتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: پہلی تین سورتوں کی ایک منزل، پھر پانچ سورتوں کی دوسری منزل، پھر سات سورتوں کی تیسری منزل، پھر نو سورتوں کی چوتھی منزل، پھر گیارہ سورتوں کی پانچویں منزل، پھر تیرہ سورتوں کی چھٹی منزل، اور مفصل کی سورتوں کی ساتویں منزل۔

(ابوداود مع العون: ص ۵۲۸ ج ۱، ابن ماجہ: رقم ۱۳۴۵، احمد: ص ۳۴۳ ج ۴ وغیرھم)

اس اعتبار سے پہلی منزل البقرۃ سے النساء تک، دوسری المائدۃ سے براءۃ تک، تیسری یونس سے النحل تک، چوتھی بنی إسرائیل سے الفرقان تک، پانچویں الشعراء سے یٰس تک، چھٹی الصافات سے الحجرات تک اور ساتویں قٓ سے آخر تک۔ اور قراء حضرات اسی ترتیب سے اختصاراً فمی بشوق سے تعبیر کرتے ہیں۔

سورۂ قٓ کا شمار مکی سورتوں میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید کی نماز اور جمعہ کے خطبہ میں اکثر اس کی تلاوت فرماتے۔ چنانچہ صحیح مسلم (ص ۲۹۱ ج ۱) مسند امام احمد (ص ۲۱۷ ج ۵) اور سنن اربعہ میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ

سے پوچھا کہ: مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَأُ فِي الْعِيْدِ ؟ رسول اللہ ﷺ عید میں کون سی سورت تلاوت فرماتے تھے؟ انھوں نے فرمایا: ق اور اِقْتَرَبَتْ.

حضرت حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ ❶ کی بیٹی حضرت ام ہشام رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں

---

❶ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ بنو نجار سے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا ان سے ننھیالی رشتہ تھا، جو سردار عبدالمطلب کے ماموں تھے۔ ہجرت کے بعد آپ نے انھی کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر بدری صحابی تھے۔ اپنی والدہ سے حسن سلوک میں بڑے معروف تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

دخلت الجنة فسمعت قراءة فقلت: من هذا؟ فقيل: حارثة بن النعمان، فقال: كذاكم البر وكان براً بأمه.

(احمد: ص ۳۶ ج ۶ واسنادہ صحیح، الاصابۃ: ص ۳۱۲ ج ۱)

''میں جنت میں داخل ہوا، تو میں نے قرآن مجید پڑھنے کی آواز سنی، میں نے پوچھا یہ کون پڑھ رہا ہے؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: والدین سے حسن سلوک کا اسی طرح اجر ملتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ اپنی والدہ سے بڑے حسن سلوک سے پیش آتے تھے۔''

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ میں رسول اللہ ﷺ کے قریب سے گزرا، آپ کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام بیٹھے تھے، میں نے انھیں سلام کہا: تھوڑی دیر بعد جب میں واپس آیا تو آپ نے فرمایا: کیا تو نے اس شخص کو دیکھا تھا جو میرے پاس بیٹھا تھا؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ نے فرمایا: وہ جبرائیل علیہ السلام تھے، انھوں نے تیرے سلام کا جواب دیا تھا۔ (مسند احمد: ص ۴۳۳ ج ۵، طبرانی: ص ۲۲۷ ج ۳ واسنادہ صحیح) اسی نوعیت کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گزرے، تو رسول اللہ ﷺ حضرت جبرائیل علیہ السلام سے باتیں کر رہے تھے، حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ انھیں پہچان نہ سکے، سمجھا کہ آپ ایک اجنبی آدمی سے گفتگو کر رہے ہیں، تو وہ خاموشی سے گزر گئے کہ میں کہیں خلل کا باعث نہ بنوں، کچھ دیر بعد واپس پلٹے تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس آدمی کو پہچان نہیں سکے جو میرے پاس بیٹھا تھا، انھوں نے عرض کیا، جی نہیں، آپ نے فرمایا: وہ جبرائیل علیہ السلام تھے انھوں نے کہا کہ اگر حارثہ رضی اللہ عنہ سلام کہتے تو میں سلام کا جواب دیتا۔ میں نے جبرائیل علیہ السلام سے کہا آپ انھیں پہچانتے ہیں تو انھوں نے کہا: بالکل یہ ان اَسی (۸۰) افراد میں سے ایک ہیں جو غزوۂ حنین میں ثابت قدم رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور ان کی اولاد کو جنت میں رزق عطا فرمائے گا۔ <=

کہ ہمارا اور رسول اللہ ﷺ کا تنور دو سال یا ایک سال کچھ ماہ تک ایک ہی تھا، آپ ہر جمعہ کے خطبہ میں سورۂ قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ کی تلاوت کرتے، یعنی اسے موضوعِ سخن بناتے اور اس کی آیات کا وعظ فرماتے اور میں نے آپ کی زبانِ اقدس سے سن سن کر یہ سورت یاد کی۔ چنانچہ ان کے الفاظ ہیں:

لَقَدْ كَانَ تَنُّوْرُنَا وَتَنُّوْرُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَاحِداً سَنَتَيْنِ أَوْسَنَةً وَبَعْضَ سَنَةٍ، وَمَاأَخَذْتُ ﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ﴾ إِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَقْرَؤُهَا كُلَّ يَوْمِ جُمُعَةٍ عَلَى الْمِنْبَرِ اِذَا خَطَبَ النَّاسَ. (مسلم: ۲۰۱۵ وغیرہ)

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سورت کی آپ کے نزدیک کیا اہمیت تھی۔ خطبۂ جمعہ میں اکثر اس کا اہتمام اس لیے تھا کہ یہ سورت توحید ورسالت کے ساتھ ساتھ موت، قیامت، جزا وسزا، حساب کتاب، جنت ودوزخ کے بیان اور رسول اللہ ﷺ کو صبر واستقامت کی تلقین پر مشتمل ہے۔ مگر آج کل ہمارے خطباے کرام عموماً اس سورت سے غافل ہیں۔ سورۂ یوسف پر مشتمل خطبات اور اس کے دروس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، اشتہارات چھپتے ہیں، سامعین کو ان کے سننے کی ترغیب دی جاتی ہے، مگر یہ اہتمام سورۂ قٓ کے لیے نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟

یہ بات ہے نہ سمجھنے کی نہ سمجھانے کی

جبکہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ كَرِهَ بَعْضُ السَّلَفِ تَعْلِيْمَ النِّسَآءِ سُوْرَةَ يُوْسُفَ ''بعض سلف صالحین نے تو عورتوں کو

=> (طبرانی، بزار وغیرہ وبإسنادہ حسن، المجمع: ص۳۱۴ ج۹ وغیرہ) حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے تو انھوں نے اپنے دروازے تک جانے کے لیے رسی باندھ رکھی تھی، جب کوئی سائل آتا تو اس رسی کو پکڑ کر دروازے پر تشریف لے جاتے اور اپنے ہاتھ سے سائل کی مدد کرتے، اہلِ خانہ عرض کرتے کہ یہ خدمت ہم سرانجام دیتے ہیں، تو وہ فرماتے میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ مسکین کو بدستِ خود دینا بری موت سے بچاتا ہے۔ (مجمع: ص۱۱۲ ج۳، اصابہ: ص۳۱۳ ج۱)

سورۂ یوسف کی تعلیم دینا پسند نہیں کیا۔'' (کتاب الرد علی الاخنائی: ص۱۱۲) قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کلام الشفا (ص ۲۱۷ ج ۲) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس سے اس بارے میں سلف کے احساسات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہماری گنگا الٹی بہتی ہے۔

اس سورت کی اہمیت اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز میں یہی سورت ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ (مسلم: ۱۰۲۷) اور سنن سعید بن منصور میں ہے یہ سورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کی پہلی رکعت میں پڑھتے تھے۔

(الدر المنثور: ص ۱۰۱ ج ۶)

جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اس سورت میں ایمان کے بنیادی اصولوں کا بیان ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم عرب تھے اور قرآن مجید جو عربی مبین میں نازل ہوا، ان کی مادری زبان تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح کی نماز، عیدین اور خطبۂ جمعہ میں اس سورت کی تلاوت فرماتے تا کہ بنیادی عقائد مستحکم ہوں، توحید و رسالت، حساب کتاب اور جزا و سزا کا تصور مستحضر رہے۔ اس کے علاوہ قیامت کے حوالے سے اس سورت میں چونکہ بتکرار فرمایا گیا ہے کہ ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ ، كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ، ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ﴾ ''یہ خروج کا دن ہے، اسی طرح قبروں سے نکلنا ہوگا، یہ حشر و نشر ہمارے لیے آسان ہے۔'' تو گویا اس میں جمعہ اور عیدین کی نماز کے لیے زیب و زینت اور بن سنور کر نکلنے والوں کے لئے پیغام ہے کہ محشر میں نکلنا بھی یاد رکھو، عید کی خوشی میں فسق و فجور میں مبتلا نہ ہو جاؤ تم نے ایک دن میدانِ محشر میں جمع ہونا ہے اور اپنا حساب کتاب چکانا ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمارے دلوں میں آخرت کی فکر پیدا کرے، اس سورت سے یہی سبق حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔ اپنی رضا کے کام آسان کر دے، دنیا اور آخرت میں عزت عطا فرمائے اور ہر قسم کی ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھے۔ آمین یا رب العالمین

ارشاد الحق اثری

25/10/06

﴿قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِيدِ﴾ (۱)

''قٓ، قسم ہے قرآنِ مجید کی۔''

قٓ حروفِ مقطعات میں سے ہے، انتیس ۲۹ سورتوں کا آغاز ان حروف سے ہوتا ہے۔ جنھیں علیحدہ علیحدہ اور جدا جدا حیثیت سے پڑھا جاتا ہے، جیسے صٓ، نٓ، حٰمٓ، طٰہٰ، طٰسٓ، الٓمٓ، الٓرٰ، الٓمٓرٰ، الٓمٓصٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ حروف ہیں۔ سورتوں کے آغاز میں ان حروف کے بارے میں اہلِ علم کی مختلف آرا ہیں، بعض نے کہا ہے: ان سے قرآن کے اعجاز کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عربی لفظ ایک حرف سے لیکر پانچ حروف سے بنتا ہے۔ کچھ وہ الفاظ ہیں جو صرف ایک حرفی ہیں، کچھ دو حرفی، کچھ ثلاثی، کچھ رباعی اور کچھ خماسی ہیں۔ قرآنِ مجید میں بھی یہ حروف اسی اسلوب میں ہیں، کچھ ایک حرفی ہیں، جیسے صٓ، نٓ، قٓ. کچھ دو حرفی ہیں جیسے حٰمٓ، طٰہٰ، یٰسٓ، طٰسٓ. کچھ تین حرفی ہیں، جسے الٓمٓ، الٓرٰ کچھ چار حرفی ہیں جیسے الٓمٓرٰ، الٓمٓصٓ اور کچھ پانچ حرفی ہیں جیسے حٰمٓ عٓسٓقٓ، کٓھٰیٰعٓصٓ اور یہ قرآن کے اعجاز پر دلالت کرتے ہیں کہ عربی کلام انھی پانچ نوعیت کے الفاظ پر مشتمل ہے، قرآنِ پاک بھی انھی حروف پر مشتمل ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ عرب کو چیلنج ہے کہ اے اہلِ عرب! تمھیں اپنی فصاحت و بلاغت پر ناز ہے، قرآن کو کلامِ الٰہی تسلیم نہیں کرتے ہو، اسے شاعر کا کلام سمجھتے ہو، تو اٹھو تم قرآن جیسی ایک سورت ہی بنالاؤ، تمھاری تمام تر لن ترانیوں کے باوجود ہم واشگاف الفاظ میں تمھیں خبردار کرتے ہیں کہ تم کیا، سب جن وانس مل کر بھی قرآن کی ایک سورت جیسی کوئی سورت نہیں بنا سکتے۔ یہ رائے امام رازی، امام مبرد، امام الفراء، علامہ زمخشری، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، علامہ المزی رحمہم اللہ کی ہے۔ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا بھی یہی رجحان ہے، فرماتے ہیں: کہ یہی وجہ ہے کہ عموماً ان حروف کے بعد قرآنِ مجید کی عظمت کا ذکر ہے۔ جیسے: ﴿الٓمٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ ﴿الٓمٓ ۝ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ

یَدَیۡہِ ﴾ ﴿الٓمٓصٓ o کِتٰبٌ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ فَلَا یَکُنۡ فِیۡ صَدۡرِکَ حَرَجٌ مِّنۡہُ ﴾ ﴿الٓمٓ o تَنۡزِیۡلُ الۡکِتٰبِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ ﴿حٰمٓ o تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ o﴾ اور دیگر آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: ص ۶۴ ج ۱)

بعض حضرات نے کہا ہے کہ ان حروفِ مقطعات سے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات مراد ہیں، اور ہر حرف اللہ تعالیٰ کے نام اور صفت پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً الٓمٓ میں الف سے اللہ، لام سے لطیف، اور میم سے مجید مراد ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شاعر کا قول ہے:

قُلۡنَا قِفِیۡ لَنَا فَقَالَتۡ: قٓ

یا یوں کہ:

قُلۡتُ لَھَا قِفِیۡ فَقَالَتۡ: قٓ

میں نے اسے کہا ٹھہر جاؤ، تو اس نے کہا قٓ یعنی ''وقفت'' میں ٹھہر گئی۔

یا جیسے کسی شاعر نے کہا:

بِالۡخَیۡرِ خَیۡرَاتٌ وَاِنۡ شَرًّا فَا

وَلَا اُرِیۡدُ الشَّرَّ اِلَّا تَا.

یہا ''فا'' سے مراد فشر ہے اور ''تا'' سے مراد تشاء ہے۔ ''یعنی بھلائی سے بہت سی بھلائیاں ملیں گی اور اگر برائی کرو گے تو اس کا بدلہ برا ہوگا۔ اور میں شر کا ارادہ تبھی کرتا ہوں جب تم شر چاہتے ہو۔'' گویا عربوں میں یہ دستور ہے کہ وہ کلمے کا ایک حرف بولتے ہیں جو اس کلمہ پر دلالت کرتا ہے۔ یہ طرز و دستور محدثین نے بھی اختیار کیا ہے۔ جیسے ''ثنا'' سے حدثنا، ''أنا'' سے أخبرنا، اور ''ح'' سے تحویل مراد لیتے ہیں۔ اور کتب احادیث کی علامات اسی دستور پر ہیں۔ ''خ'' سے بخاری۔ ''م'' سے مسلم، ''د'' سے ابوداود، ''ت'' سے ترمذی، ''س'' سے نسائی، ''ق'' سے ابن ماجہ قزوینی۔ حتی کہ سرکاری القاب، سرکاری عہدوں، تجارتی فرموں اور کمپنیوں میں بھی یہ دستور عام ہو گیا ہے۔ مگر حافظ ابن

کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کلامِ عرب میں سیاقِ کلام اس معنی پر دلالت کرتا ہے، مگر قرآنِ مجید میں یہ حروفِ مقطعات اس سیاق میں وارد نہیں ہوئے۔

بہت سے مفسرین نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ حروف سورتوں کے نام ہیں۔ جیسے سورۂ طٰہٰ، سورۂ یٰسٓ، سورۂ قٓ، سورۂ صٓ، سورۂ نٓ، سورۂ الٓمٓ السجدۃ وغیرہ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ کے روز صبح کی نماز میں ﴿الٓمٓ، السَّجْدَةُ﴾ اور ﴿هَلْ أَتَى عَلَى الْإِنسَانِ﴾ پڑھتے تھے، (بخاری: رقم ۸۹۱، مسلم: رقم ۲۰۳۴) لیکن یہ بات تو بین ہے کہ بہت سی سورتیں ان حروف مقطعات کے ناموں سے مشہور نہیں ہوئیں اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سورتوں کے یہ نام توقیفی ہیں۔ (الاتقان: ص ۵۲ ج ۱)۔ بہر نوع یہ حروف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نام پر دلالت کرتے ہوں یا یہ سورتوں کے نام ہوں یا یہ تحدی اور اعجاز کے طور پر ہوں اس سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ عربوں کے ہاں یہ اسلوبِ کلام بیگانہ اور اجنبی نہ تھا۔ اگر یہ ان کے مزاج کے مطابق نہ ہوتا تو وہ ضرور اس پر معترض ہوتے۔ قرآن پر معاندین نے بہت سے اعتراضات کیے، قرآنِ پاک ہی میں ان کا جواب بھی دیا گیا، مگر ان حروف کے بارے میں ان کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اسلوب بیان ان کے ہاں متعارف تھا۔ رہی یہ بات کہ ان کے معانی و مطالب کیا ہیں، یقیناً ان کے معانی اللہ تعالیٰ کے ہاں تو متعین ہیں، لیکن رسول اللہ ﷺ سے کوئی چیز اس بارے میں ثابت نہیں، نہ ہی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ آپ ﷺ سے اس بارے میں دریافت کریں۔ اگر ان حروف کے معانی معلوم کرنے میں ہی ہدایت کا انحصار ہوتا تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بارے میں قطعاً خاموش نہ رہتے، بلکہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ ان حروف کا علم اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ یہی قول امام عامر شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خثیم، ابو حاتم ابن حبان رحمہم اللہ کا ہے۔ (ابن کثیر: ص ۳۸ ج ۱) بلکہ اکثر متاخرین کا یہی قول ہے کہ ان حروف کی تحقیق میں سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں۔ بس ہمیں یہی کہنا چاہیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہم اس

پر ایمان رکھتے ہیں۔ آمنا به کل من عند ربنا.

امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ عبادات تین قسم کی ہیں: (۱) عبادتِ قلبی (۲) عبادتِ لسانی (۳) عبادتِ جسمانی۔ اور ان تمام عبادات میں بعض وہ ہیں جو معقول المعنی ہیں اور بعض وہ ہیں جن کی تعبیر عقل وفکر سے بالاتر ہے۔ مثلاً عبادتِ جسمانی میں ایک حج بھی ہے۔ لیکن رمی جمار اور صفا ومروہ کے مابین سعی کی کوئی عقلی توجیہ نہیں، حاجی بس اللہ کا بندہ ہے اور حق بندگی ادا کر رہا ہے۔ عبادتِ قلبی میں توحید، رسالت اور قیامت سب کی عقلی توجیہات اور ان کی صداقت ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، مگر پل صراط جو تلوار سے تیز اور بال سے باریک ہوگی، معقول المعنی نہیں۔ ایک عرصہ تک تو وزنِ اعمال بھی غیر معقول المعنی تھا اور ہم یہ سب تسلیم کرتے اور ان پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح عبادتِ لسانی میں یہ حروف تہجی اور یہ حروفِ مقطعات ہیں، جن کے معنی معلوم نہیں، یہ حروف اسی طرح پڑھنا مطلوب ہیں اور باعث اَجر وثواب ہیں۔ جیسا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> مَنْ قَرَأَ حَرْفاً مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا لَا أَقُوْلُ (الٓمّٓ) حَرْفٌ وَلٰكِنْ أَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ (ترمذی: رقم ۲۹۱۰)

> ''جو اللہ کی کتاب سے ایک حرف پڑھتا ہے اسے ایک نیکی ملتی ہے اور ایک نیکی کا دس گنا درجہ وثواب ہے میں نہیں کہتا ﴿الٓمّٓ﴾ ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔''

اور اسی سے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ قرآن پڑھنے کا تبھی فائدہ ہے جب اس کے معانی ومطالب سمجھ کر پڑھا جائے، حالانکہ کتنے ہیں جو اس کے مطالب ومعانی سے واقف ہیں، مگر اس سے مستفید نہیں ہوتے، بلکہ وہ ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ کا مصداق ہیں، ایمان ویقین ہی سے پڑھا جائے تو اس کا فائدہ ہے، متقین ہی کے لئے یہ باعث ہدایت ہے۔ اور ایمان سے جو اس کی تلاوت کرتا ہے اسے بھی ہر حرف کے بدلے دس

نیکیاں ملتی ہیں۔آپ ﷺ نے ﴿الٓمٓ﴾، جو غیر معقول المعنی حروف ہیں، کی مثال دے کر اس وہم کی جڑ کاٹ دی کہ بغیر سمجھ کے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔قرآنِ پاک کی تلاوت، اس کی تعلیم اور اس پر عمل تینوں مطلوب و مقصود ہیں۔

اس سورۂ قٓ میں ''قٓ'' سے مراد اور اس کے معنی میں وہ تمام مفہومات اور توجیہات ہیں جو مختصراً ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، کہ یہ حرف دیگر حروفِ مقطعات کی طرح تحدی کے طور پر بھی ہو سکتا ہے، یہ اللہ کی صفت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ وہی قیوم، قادر، قاہر، قریب اور قاضی الامور ہے۔سورت کا نام تو یہ ہے ہی، اور یہ بھی کہ حقیقتاً تو اس کی مراد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول منقول ہے کہ اس سے مراد ایک پہاڑ ہے، جو زمین کو گھیرے ہوئے ہے، جس کا نام قاف ہے، مگر حافظ ابن کثیر نے اسے اسرائیلی خرافات قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کی سند درست نہیں۔

''وٓ'' حرف قسم ہے اور ''القرآن'' علم یعنی نام ہے۔جیسے ''تورات'' اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔اور ''انجیل'' اس کتاب کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔اور ''زبور'' حضرت داود علیہ السلام پر نازل کی گئی۔''القرآن'' نام خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تقریباً اڑسٹھ (۶۸) مقامات پر اسی نام سے یاد کیا ہے۔۵۰ بار بطور معرفہ یعنی الف لام کے ساتھ اور ۱۲ بار بغیر معرفہ کے آیا ہے۔

(المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم: ص۵۳۹، ۵۴۰)

''القرآن'' کے علاوہ اس کے نام الفرقان، الذکر، الکتاب، قرآنِ مجید ہی میں اسمِ علم کے طور پر آئے ہیں۔''الفرقان'' کے لیے دیکھئے آل عمران (آیت:۴) الفرقان (۱)۔ ''الذکر'' کے لیے دیکھئے الحجر (۹) النحل (۴۴)۔الکتاب: البقرۃ (۱) الکھف (۱) بلکہ یہ اسم تو متعدد مقامات پر آیا ہے۔امام ابنِ جریر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو کچھ رسول اللہ ﷺ پر نازل فرمایا اس کے یہی چار نام ہے۔(جامع البیان: ص۴۱، ۴۲ ج ۱) علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الاتقان (ص ۵۱ ج ۱) میں ذکر کیا ہے کہ علامہ ابو المعالی عزیزی بن عبد

الملک نے ''البرھان'' میں قرآنِ مجید کے پچپن (۵۵) نام ذکر کیے ہیں۔ جیسے التنزیل، الکریم، المجید، الحکیم وغیرہ، مگر یہ قرآنِ مجید کی صفات ہیں۔ بطورِ علَم چار نام ہی قرآنِ مجید میں استعمال ہوئے ہیں جیسا کہ امام ابنِ جریر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔

''القرآن'' کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآن، رجحان اور کفران کے وزن پر قَرَأَ یَقْرَأُ کا مصدر قِرَاءَۃٌ اور قُرْآنٌ ہے، اور پڑھنے کے معنی میں ہے، گویا یہ کتاب پڑھنے کے لیے نازل ہوئی ہے اور قیامت تک پڑھی جائے گی، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی یہی کتاب قرآنِ مجید ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''القرآن'' مہموز یعنی قراءت سے مشتق نہیں بلکہ یہ نام اور علَم ہے، جیسے تورات اور انجیل پہلی کتابوں کا علَم ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: میں نے اسماعیل بن قسطنطین سے قرآن پڑھا وہ فرماتے تھے: قرآن، قراءت سے مشتق نہیں اگر قراءت سے مشتق ہوتا تو جو کچھ پڑھا جاتا وہی قرآن کہلاتا، بلکہ ''قرآن'' نام ہے (تاریخ بغداد: ص۶۲ ج۲) علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(الاتقان: ص۵۱ ج۱)

امام اشعری رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: یہ ''قرن'' سے مشتق ہے۔ عرب جب ایک کو دوسری چیز سے ملاتے تو کہتے قرنت الشیء بالشیء قرآن میں بھی سورتیں، آیات ایک دوسری سے ملائی اور جوڑی گئی ہیں۔ جو جدا جدا نازل ہوئی تھیں۔ علامہ زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن مہموز ہے۔ قرأ سے مشتق ہے جیسے الغفران اور فعلان ہے اور اس کے معنی جمع کرنے کے ہیں، عرب کہتے تھے قرأ الماء فی الحوض پانی حوض میں جمع ہو گیا۔ اور ''قرآن'' اس معنی میں کہ اس میں باہم سورتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ علامہ راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر مجموعہ کو اور مجموعہ کلام کو قرآن نہیں کہا جاتا، بلکہ یہ اس معنی میں ہے کہ اس میں تمام کتبِ سابقہ کے ثمرات و مقاصد کو جمع کر دیا گیا۔ یا اس لیے کہ اس میں تمام علوم جمع ہیں، (الاتقان) گویا علامہ زجاج اور امام اشعری قرآن کو جمع کے معنی میں لیتے ہیں البتہ اس کے

اشتقاق میں ان کا رجحان مختلف ہے۔ قرآن میں آیات اور سورتوں کی جمع وترتیب بھی مسلمہ امر ہے۔ قرآن نجماً نجماً نازل ہوا ترتیب نزولی کے بغیر ہر ایک آیت کو اس کے محل پر ایسا جمع کیا گیا ہے کہ ان میں باہم معنوی مناسبت پر عقل وخرد جھوم جھوم جاتی ہے۔ آیات ہی نہیں سورتوں کی ترتیب وجمع میں بھی یہی نوعیت ہے۔

﴿وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ﴾: ''قسم ہے قرآنِ مجید کی۔''

مجید کے معنی صاحبِ کرم وفضل، بزرگ، برتر اور باعظمت کے ہیں، یہ لفظ اللہ ﷻ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک اسم مبارک ہے، اور قرآنِ مجید میں دو مقامات پر اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ ۝﴾

(البروج:۱۴، ۱۵)

''اور وہی (گناہگاروں کو) بخشنے والا اور (نیکوں سے) محبت کرنے والا ہے۔ عرش کا مالک بڑی شان والا ہے۔'' ❶

اور ایک دوسرے مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں، جب انھیں اور ان کی بیوی کو بڑھاپے میں بیٹے کی بشارت دی گئی اور ان کی اہلیہ حضرت سارہ علیہا السلام نے اس پر تعجب کا اظہار کیا، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر اس وقت تقریباً سو سال اور حضرت سارہ علیہا السلام کی ۹۰ سال ہو چکی تھی۔ تو فرشتوں نے کہا:

﴿اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ وَرَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۝﴾ (ھود:۷۲، ۷۳)

''کیا تم اللہ کی قدرت پر تعجب کرتی ہو، اے گھر والو! تم پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو، بے شک وہ تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔''

قرآنِ پاک کے بارے میں بھی یہ لفظ دو ہی بار استعمال ہوا ہے، ایک اسی مقام

---

❶ عاصم کے علاوہ کوفیوں کے نزدیک ''مجید'' یہاں عرش کی صفت ہے۔ فتح القدیر (ص ۴۰۲ ج ۵)

پر سورۂ قٓ میں، اور دوسری جگہ سورۃ البروج میں، چنانچہ فرمایا ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌo فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍo﴾ (البروج:۲۱،۲۲)

''بلکہ وہ قرآن بڑی بزرگی والا ہے، لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔''

قرآن کی عظمت

ہر کلام متکلم کی صفت کا ترجمان ہوتا ہے۔ معروف محاورہ ہے: کَلَامُ الْمُلُوْکِ مَلِکُ الْکَلَامِ کہ بادشاہوں کا کلام، کلام کا بادشاہ ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ سب سے بزرگ و برتر اور علوِ شان میں سب سے بلند و بالا ہے، اسی طرح اس کا کلام بھی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان میں سب کلاموں سے بڑھا ہوا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعظ و خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے:

إِنَّ خَیْرَ الْحَدِیْثِ کِتَابُ اللّٰهِ ، وَخَیْرَ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم .
الحدیث (مسلم: رقم ۲۰۰۵)

''بے شک تمام کلاموں میں بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے، اور تمام طریقوں میں بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہے۔''

بلکہ یہ ایسا بزرگ و برتر کلام ہے کہ جو اس سے وابستہ ہوتا ہے، اسے سمجھتا اور عمل کرتا ہے، وہ بھی بزرگ اور دوسروں سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک جس ہستی پر نازل ہوا، وہ باقی مخلوق میں سب سے افضل و برتر، جس ماہِ مبارک میں نازل ہوا، وہ سب مہینوں سے افضل، جس رات نازل ہوا، وہ رات سب راتوں سے افضل، جس شہر میں نازل ہوا وہ تمام شہروں سے افضل، نماز بھی سب سے وہ افضل جس میں قرآنِ پاک زیادہ پڑھا جائے۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَفْضَلُ الصَّلَاةِ طُوْلُ الْقُنُوْتِ (مسلم رقم: ۱۷۶۸)

''سب سے افضل نماز وہ جس میں قیام لمبا ہو۔''

امامت کا حقدار وہ جو سب سے زیادہ قاریٔ قرآن ہو، چنانچہ حضرت ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ (مسلم: رقم ۱۵۳۲)

''کہ لوگوں کو نماز وہ پڑھائے جوان میں سے قرآن کا سب سے بڑا قاری ہو۔''

بلکہ جب جہاد کے دوران میں یا کسی وبا یا سانحہ یا حادثہ کی صورت میں اموات کثرت سے ہوں تو دو چار میتوں کو ایک ہی قبر میں بھی دفن کیا جا سکتا ہے اور دفن کرنے میں سب سے پہلے لحد میں بجانبِ قبلہ اسے رکھا جائے گا جو قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والا ہوگا۔ حضرت ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ احد میں شہدا کو دفن کرنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ قبر کو گہرا اور اچھا بناؤ اور ایک قبر میں دو دو، تین تین کو دفن کرو۔ ہم نے عرض کیا جناب! سب سے پہلے کسے رکھیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قَدِّمُوْا أَكْثَرَهُمْ قُرْآناً سب سے پہلے اسے رکھو جوان میں قرآن کا زیادہ حافظ وقاری ہو۔

(ابوداود: رقم ۳۲۱۵، ترمذی: رقم ۱۷۱۳ وصححہ، النسائی، رقم ۲۰۱۷، ۲۰۱۸، وغیرہ)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبد الحارث الخزاعی رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کا منتظم بنایا تھا، ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، تو حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر وادی عُسفان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا استقبال کیا، انھوں نے حضرت نافع رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ یہاں آ گئے ہیں مکہ مکرمہ کا انتظام کس کے سپرد کر کے آئے ہو، انھوں نے کہا: ابن ابزیٰ کے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ابن ابزیٰ کون ہے؟ حضرت نافع رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ ہمارے غلاموں میں سے ایک غلام ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اہلِ مکہ پر تم نے غلام کو منتظم بنادیا، تو حضرت نافع نے کہا: إِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَإِنَّهُ عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ ''کہ وہ قرآن کا قاری اور علمِ وراثت کو جانتا ہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَاماً وَيَضَعُ بِهِ آخَرِيْنَ.

(مسلم: ص۲۷۲ج ارقم: ۱۸۹۷)

''کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کی برکت سے قوموں کو سر بلندی نصیب کرے گا

اور اس کو نظر انداز کرنے والوں کو نیچے گرادے گا۔‘‘

قرآنِ مجید وادِ غیر ذی زرع میں نازل ہوا، جو اس کے اولین مخاطب تھے وہ امی، تعلیم وتعلم سے نا آشنا، نہ تمدن، نہ معیشت، نہ صنعت وحرفت، نہ اتفاق واتحاد، بلکہ قبائلی حمیت ان میں جلوہ گر، رہزن اور صحرانشیں، وہ یکا یک سرزمینِ حجاز سے آگے قیصر وکسریٰ کے فاتح کیونکر بن گئے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے قرآنِ پاک کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی تربیت سے۔ اقبال مرحوم نے رسول اللہ ﷺ کے اسی فرمان اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فتوحات کی روشنی میں کس قدر حقیقت پسندانہ بات کہی ہے۔ ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

یہاں قرآنِ مجید کے فضائل وبرکات اور اعجازات کی تفصیل مقصود نہیں، نہ ہی یہ ہمارا موضوع ہے، بس یہ بتلانا مقصود تھا کہ اس پُرعظمت کتاب سے جو وابستہ ہوا وہ سرخرو ہوا اور جس نے اس سے رخ موڑا وہ ذلیل ورسوا ہوا۔ یہی حبل اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے مابین مضبوط واسطہ ہے، آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجتے ہوئے یہ پیغام دیا تھا:

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ﴾
الآية (طٰہٰ:۱۲۳)

’’اگر میری طرف سے تمھارے پاس ہدایت آئے، جو کوئی میری ہدایت پر چلے گا نہ وہ گمراہ ہوگا، نہ بدنصیب ہوگا۔‘‘

حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

’’قَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَالَنْ تَضِلُّوا بَعْدَهُ إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ كِتَابَ اللّٰهِ‘‘
(مسلم: رقم ۲۹۵۰)

’’میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں، جس کے ساتھ تم وابستہ رہو گے تو تم ہرگز گمراہ نہیں ہوگے، وہ اللہ کی کتاب ہے۔‘‘

اور ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

''تَرَکْتُ فِیْکُمْ أمْرَیْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَاتَمَسَّکْتُمْ بِهِمَا کِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ''

''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں تم جب تک انھیں مضبوطی سے تھامے رکھو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، وہ ہیں اللہ کی کتاب اور میری سنت۔''

اس لیے ہدایت کے اب یہی دو چشمے ہیں، قرآنِ مجید متن ہے اور سنت و حدیث اس کی تبیین و تعبیر ہے، یہی اسلام ہے جس کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے کر دی اور اپنے ارشادات کا اتمام فرما دیا:

﴿تَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِهٖ ج وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ٥﴾ (الانعام:ص ۱۱۶)

''تیرے رب کا سچائی اور انصاف پر مبنی کلام مکمل ہوا، اس کے کلام کو کوئی بدل نہیں سکتا اور خوب سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس کی تمام خبریں اور باتیں سچی اور تمام احکام عدل و انصاف پر مبنی ہیں اور جو کوئی اس کے نظامِ عدل پر غور و فکر کرے گا اس پر اس کے عدل و اعتدال کی قدریں نکھرتی جائیں گی، حق و سچ اور عدل و انصاف کہیں ہے تو وہ وہی جسے قرآنِ مجید نے اجاگر کیا ہے، یہی سب کتابوں کے لیے ''مهیمن'' ہے اور ان کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ہے۔

دنیا کی بقا قرآن سے

بلکہ دنیا کی بقا کا ذریعہ قرآن ہے۔ چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

یَدْرُسُ الْإِسْلَامُ کَمَا یَدْرُسُ وَشْيُ الثَّوْبِ حَتّٰی لَا یُدْرٰی مَاصِیَامٌ وَلَا صَلَاةٌ وَلَا نُسُکٌ وَلَا صَدَقَةٌ وَلَیُسْرٰی عَلٰی کِتَابِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فِیْ لَیْلَةٍ فَلَا یَبْقٰی فِی الْاَرْضِ مِنْهُ آیة،الحدیث.

(ابن ماجہ رقم: ۴۰۴۹)

''اسلام ختم ہو جائے گا جس طرح کپڑے کے نقش و نگار ختم ہو جاتے

ہیں۔حتی کہ کوئی نہیں جانے گا کہ روزہ کیا ہے، نہ نماز کو جانے گا، نہ حج کو، نہ صدقہ کو اور وہ کتاب اللہ ایک ہی رات میں چل دے گی، تو اس میں سے ایک آیت بھی زمین پر نہیں رہے گی۔''

منکرین وملحدین قرآنِ مجید اور اس کی تعلیمات کو ختم کرنے کے درپے ہیں، مگر ان کو یہ خبر نہیں کہ قرآنِ مجید کا وجود تو دنیا کے وجود کا باعث ہے، جب قرآنِ مجید نہیں ہوگا تو یہ دنیا بھی اپنا جواز کھو بیٹھے گی، گویا اللہ کا کلام دنیا کے وجود و بقا کا ضامن ہے، مگر ناداں اس کے پیچھے پڑے ہیں۔إنا للہ وإنا إلیه راجعون.

قرآن اللہ نے نازل فرمایا ہے

قرآنِ مجید کی عظمت اس اعتبار سے بھی نمایاں ہے کہ اس کے من جانب اللہ ہونے اور اس کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہونے، دونوں کا اظہار قرآنِ مجید ہی میں موجود ہے اور اس کا معجزہ ہونا، جس طرح اس کے نزول کے وقت تھا آج بھی اس کا اعجاز بدستور قائم ہے اور قیامت تک قائم رہے گا، قرآنِ پاک کی بیان کردہ آفاقی شہادتیں نت نئے دن اس کی صداقت اور اس کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت پیش کرتی رہتی ہیں۔نہایت اختصار سے عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَى قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾ (الشعراء:۱۹۲،۱۹۴)

''بے شک یہ قرآن اسی کا اتارا ہوا ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح (جبرئیل علیہ السلام) اتری ہے تاکہ تم ان میں شامل ہو جاؤ جو ڈرانے والے ہیں۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ۝ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ﴾ (الحاقۃ:۴۰،۴۱،۴۲)

''بے شک یہ قرآن عزت والے فرشتے کا لایا ہوا ہے۔ اور وہ شاعر کا کلام نہیں تم بہت کم یقین کرتے ہو اور نہ کاہن کا کلام ہے تم بہت کم نصیحت پکڑتے ہو۔ سارے جہاں کے مالک کا اُتارا ہوا ہے۔''

گویا یہ قرآنِ مجید، اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے، جبریل علیہ السلام اسے لے کر آئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ اطہر پر اس کا نزول ہوا ہے، آپ اس کو حفظ وضبط کرنے کے لیے جلدی جلدی پڑھتے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴾ (القیامۃ:۱۶،۱۷)

''آپ اپنی زبان نہ ہلایا کریں اس کو جلدی سے یاد کر لینے کے لیے، اس کو تمھارے دل میں جما دینا اور اس کا پڑھا دینا ہمارا کام ہے۔''

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ آیت (۱۱۴) میں بھی بیان فرمائی۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ اطہر میں محفوظ ہونے کی تخصیص نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالعموم فرمایا ہے کہ:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

''بے شک ہم نے ہی ذکر کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

صحیح مسلم میں حضرت عِیاض المجاشعی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَنْزَلْتُ عَلَيْكَ كِتَاباً لَا يَغْسِلُهُ الْمَاءُ. (مسلم: ص ۳۸۵ ج ۲ کتاب الجنة وصفة نعيمها، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة وأهل النار)

''کہ میں نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جسے پانی نہیں دھو سکے گا۔''

چنانچہ کتاب اللہ کی یہ حفاظت وصیانت قرنِ اول سے تاہنوز ہزاروں نہیں لاکھوں افراد کے ذریعے سے ہو رہی ہے، بچے، جوان، بوڑھے، خواہ مرد ہیں یا عورتیں اس سعادت سے تواتر اُبہرہ ور ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ سیکڑوں صفحات پر مشتمل کتاب اللہ کا یہ اعجاز ہے کہ اس کو ضبط وحفظ کرنے والوں نے اسے چھ ماہ میں، تین ماہ میں، حتی کہ ایک

ماہ میں بھی حفظ کیا، جس کی تفصیل بڑی ایمان افروز اور دلچسپ ہے، مگر یہ اس کا محل نہیں۔

قرآن کی نظیر ناممکن ہے

قرآن کی عظمتِ شان کا یہ پہلو بھی آج تک، بلکہ قیامت تک قائم رہے گا۔ جسے قرآنِ پاک نے تحدی اور چیلنج کے طور پر فرمایا ہے کہ تمام جن وانس مل کر بھی قرآنِ پاک جیسی کتاب نہیں لا سکتے۔ (الاسراء: ۸۸)

قرآنِ مجید جیسی کتاب لانا تو کجا، وہ ایک سورت بھی نہیں لا سکتے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾

(البقرۃ: ۲۳)

”اگر تمھیں اس چیز کے بارے میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے، تو لاؤ اس کی مانند کوئی سورت اور بلا لاؤ اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو۔“

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس میں بھی فرمائی ہے کہ

﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ (یونس: ۳۸)

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (قرآن) کو خود بنا لیا ہے۔ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورت اس جیسی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس جس کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو۔“

تاریخ و واقعات شاہد ہیں کہ اس چیلنج کو مخاطبین نے اپنے تمام تر دعویٰ فصاحت و بلاغت کے باوجود قبول نہیں کیا، انھوں نے اس کی بجائے کٹھن راہ اختیار کی، قرآنِ مجید اور اس کی دعوت کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے اپنے مال، جان اور اولاد کی قربانی دی، بدر، احد، احزاب کے معرکے لڑے۔ مگر وہ قرآنِ مجید کے مقابلے میں ایک سورت بھی نہ بنا سکے۔

شعرائے عرب میں ایک نامور شاعر لبید شاعر کا بھی ہے، کہتے ہیں کہ اس کے ایک شعر پر سوقِ عکاظ میں تمام شعراء نے اس کو سجدہ کیا تھا، اور عرب کی روایات کے مطابق اعزاز کے طور پر اس کا قصیدہ بیت اللہ میں آویزاں کیا گیا۔ فرزدق نے ایک آدمی سے لبید کا شعر سنا، تو وہ اپنے گھوڑے سے اترا اور سجدہ میں گر گیا، مگر یہی لبید جب مسلمان ہوا، بلکہ شرف صحبتِ نبوی سے فیض یاب ہوا تو شعر کہنا چھوڑ دیا۔ جو شاعر، ملک الشعراء اور مسجود الشعراء ہو، اور عرب کی فصاحت و بلاغت کا مظہرِ کامل ہو، اس کا یوں شعر گوئی ترک کر دینا تعجب کا باعث بنا، لوگوں نے پوچھا کہ شعر کیوں نہیں کہتے تو انھوں نے فرمایا: أبعد القرآن ، کہ کیا قرآن کے بعد بھی اس کی گنجائش ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عاملِ کوفہ کو لکھ بھیجا کہ لبید سے کہو کہ اسلام لانے کے بعد آپ نے جو اشعار کہے ہیں وہ کیا ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا: اشعار کے بدلے اللہ نے مجھے سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران دی ہے۔ (الشعر والشعراء، الاصابہ) اس عظیم شاعر اور فصاحت و بلاغت کے امام کا قرآنِ پاک کے اعجاز و بلاغت کا یوں اعتراف اور اظہار اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ عرب کی فصاحت و بلاغت نے قرآنِ پاک کے اعجاز اور اس کی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

شعرائے سبعہ معلقہ میں امراء القیس وہ شاعر تھا جس کا قصیدہ نزولِ قرآن کے بعد بھی بیت اللہ میں آویزاں رہا اور اس کی بہن نے اسے اتارنے سے انکار کر دیا، مگر جب اس نے قرآنِ مجید کی طوفان نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ آیت سنی:

﴿وَقِيلَ يَآ أَرْضُ ابْلَعِي مَآءَكِ وَيَا سَمَآءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَآءُ﴾

(ھود: ۴۴)

''اور کہا گیا: اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان برسنے سے تھم جا، اور خشک ہو گیا پانی۔''

تو اس نے اپنے بھائی کا قصیدہ بھی اتار دیا۔

(اعجاز القرآن، مصطفیٰ صادق الرافعی: ص ۲۰۴)

ابن راوندی، جس کا نام احمد بن یحییٰ ابوالحسن المتوفی ۲۹۳ھ، معتزلی تھا، پھر رافضی

بنا اور اس سے بڑھ کر الحاد و زندقت کی وادیوں میں چلا گیا، اسلام کی تردید میں کتابیں لکھتا اور اس کے عوض یہودیوں سے مال و زر وصول کرتا، مشہور معتزلی ابو علی جبائی سے بغداد کے پل پر ابن راوندی کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا: قرآن کے مقابلے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں سے کچھ سنو گے، جبائی نے کہا میں تیرے شرمناک علوم سے واقف ہوں، اے ابن راوندی میں تم کو ہی منصف تسلیم کرتا ہوں، بتلاؤ

هَلْ تَجِدُ فِيْ مُعَارَضَتِكَ لَهٗ عُذُوْبَةً وَهَشَاشَةً وَ تَشَاكُلًا وَتَلَاؤُماً وَنَظْماً كَنَظْمِهٖ وَحَلَاوَتِهٖ ؟قَالَ لَا وَاللّٰهِ قَالَ قَدْ كَفَيْتَنِي فَانْصَرِفْ حَيْثُ شِئْتَ. (اعجاز القرآن للرافعی: ص ۲۰۷)

”کیا تم اپنے قرآن میں وہ مٹھاس، بشاشت و نرمی، موافقت، درستی اور نظم پاتے ہو جو نظم اور شیرینی قرآن میں ہے؟ اس نے کہا اللہ کی قسم ہرگز نہیں، جبائی نے کہا تم نے فیصلہ کر دیا اب جہاں چاہتے ہو جاؤ۔“

یہ اور اس نوعیت کے دوسرے واقعات قرآنِ مجید کے اس اعجاز اور اس کی عظمت کی دلیل ہیں، اس کی اندرونی شہادتیں اس پر مستزاد ہیں۔ مگر اس کی تفصیل اور قرآنی اعجازات کا استیعاب یہاں مقصود نہیں، بلکہ مقصد قرآنِ مجید کی بزرگی و عظمت کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ تھا، جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے۔

قرآنِ مجید کی یہ قسم کہ ﴿وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ قرآنِ مجید کی قسم ہے، یہ قسم کس بات پر کھائی گئی ہے، اس کا مقسم علیہ محذوف ہے اور وہ کیا ہے؟ اس کے بارے میں صحیح ترین قول یہ ہے کہ اس سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں یعنی فرمایا گیا ہے کہ قرآنِ مجید کی قسم محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور ان کی رسالت کا انکار بلا دلیل ہے، جیسا کہ سورۂ یٰس میں فرمایا ہے کہ ﴿يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ ”قرآنِ حکیم کی قسم، بے شک آپ رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔“ سورۂ صٓ میں بھی فرمایا گیا ہے:

﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ ۝ بَلْ

عَجِبُوْا أَنْ جَآءَ هُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ﴾

''قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی، بلکہ یہی لوگ جنھوں نے ماننے سے انکار کیا ہے، سخت تکبر اور ضد میں مبتلا ہیں ان سے پہلے ہم ایسی کتنی قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں۔ (جب ان پر عذاب آیا تو) وہ چیخ اٹھے، مگر وہ وقت بچنے کا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو اسی بات پر بڑا تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انھی میں سے آ گیا اور منکرین کہنے لگے کہ یہ ساحر ہے سخت جھوٹا ہے۔''

امام قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ یہاں قسم عزة وشقاق میں ہے، اور یہ تکبر اور ضد رسول اللہ ﷺ کے انکار پر مبنی ہے جن کے رسول بنائے جانے پر وہ تعجب کا اظہار کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جواب قسم یہ ہے کہ ''قیامت آنے والی ہے'' جیسا کہ بعد کی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں۔

سورۂ طور میں بھی ہے:

﴿وَالطُّوْرِ o وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ o فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ o وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ o وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ o وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ o إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ o مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ﴾ (الطّور:۱۔۸)

''قسم ہے طور کی اور ایسی کتاب کی، جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے، اور آباد گھر کی اور اونچی چھت کی اور موجزن سمندر کی کہ تیرے رب کا عذاب ضرور آنے والا ہے۔ جسے کوئی دور کرنے والا نہیں۔''

یہاں پانچ چیزوں کی قسم کھا کر فرمایا گیا ہے کہ تیرے رب کا عذاب ضرور آنے والا ہے، اور اس عذاب سے مراد قیامت ہے۔ اسی طرح سورۂ قٓ میں بھی جواب قسم یہ ہے قیامت آنے والی ہے، بلکہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جواب قسم إثبات النبوة و إثبات المعاد نبوت اور قیامت دونوں کا اثبات ہے۔

یہاں یہ لطیف بات بھی پیشِ نظر رہے، جس کی طرف امام رازی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے کہ قرآنِ مجید میں قسم کا اسلوب مختلف انداز پر ہے، جس کی تفصیل بأ دنٰی تصرف یوں ہے۔

۱۔ کبھی اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کی قسم کھائی ہے، جیسے: ﴿وَالْعَصْرِ﴾ اور ﴿وَالنَّجْمِ﴾ میں ہے، جیسے حروفِ مقطعات ایک حرفی ہیں جیسے صٓ، نٓ، قٓ. امام رازی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حروف بھی بطور قسم ہیں۔

۲۔ کبھی قسم دو چیزوں کی کھائی ہے، جیسے: ﴿ وَالضُّحٰیo وَاللَّیْلِ إِذَا سَجٰی ﴾ اور ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴾ اور بعض حروفِ مقطعات بھی دو حرفوں کا مجموعہ ہیں۔ جیسے طٰهٰ، طٰسٓ، یٰسٓ، حٰمٓ.

۳۔ کبھی قسم تین چیزوں کی کھائی ہے. جیسے: ﴿ وَالصَّآفَّاتِ صَفًّاo فَالزَّاجِرَاتِ زَجْراًo فَالتَّالِیَاتِ ذِکْراً ﴾ اور بعض حروفِ مقطعات بھی تین حرفی ہیں۔ جیسے: الٓمٓ، طٰسٓمٓ، الٓرٰ.

۴۔ کبھی قسم چار چیزوں کی کھائی، جیسے سورۃ الذاریات میں ہے: ﴿وَالذَّارِیَاتِ ذَرْواًo فَالْحَامِلَاتِ وِقْراًo فَالْجَارِیَاتِ یُسْراًo فَالْمُقَسِّمَاتِ أَمْراًo ﴾ اور بعض حروفِ مقطعات بھی چار حرفی ہیں جیسے الٓمٓصٓ، الٓمٓرٰ.

۵۔ کبھی قسم پانچ امور کی کھائی ہے۔ اور بعض حروفِ مقطعات بھی پانچ حرفی ہیں۔ جیسے: کٓھٰیٰعٓصٓ، حٰمٓo عٓسٓقٓ. بلکہ سورۃ ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا﴾ کے علاوہ کسی جگہ بھی پانچ امور سے زائد قسم نہیں، اور نہ ہی پانچ سے زائد حروفِ مقطعات ہیں۔

﴿بَلْ عَجِبُوْآ اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ﴾ (۲)

''بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا ہے کہ ایک خبردار کرنے والا خود انھی میں سے ان کے پاس آ گیا، پھر کافروں نے کہا: یہ عجیب بات ہے۔''

یہاں ﴿بل﴾ اس بات کا قرینہ ہے کہ مقسم علیہ محذوف ہے، یعنی معاملہ اس طرح نہیں جس طرح منکرین کہتے ہیں، کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول نہیں، قرآنِ مجید کی قسم! آپ اللہ کے رسول ہیں، مگر انھیں تعجب اس بات پر ہے کہ انھی میں سے ایک رسول ان کے پاس آ گیا ہے۔ آپ کی رسالت کے بارے میں کفار نے صاف صاف کہا: ﴿وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا﴾ (الرعد:۴۳) کہ آپ رسول نہیں ہیں، اس لیے کہ آپ تو ہم ہی میں سے ایک فرد ہیں، ہماری طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں۔ چنانچہ قوم عاد نے یہی بات حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں کہی کہ:

﴿مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخَاسِرُوْنَ﴾

(المؤمنون:۳۳، ۳۴)

''یہ تو تمھارے جیسا بشر ہے، جو کچھ تم کھاتے ہو وہ بھی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہ بھی پیتا ہے اور اگر تم نے اپنی طرح کے آدمی کی اطاعت کی تو تم نقصان اٹھاؤ گے۔''

اسی طرح وہ یہ بھی کہتے تھے:

﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۷)

''یہ کیسا رسول ہے کھانا وہ کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے''

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:٢٠)

''اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھیجے وہ سب کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔''

یہ اور اس نوعیت کے بے وزن اعتراضات انھوں نے آپ ﷺ کے رسول ہونے پر کیے، جن کا ذکر مع جوابات متعدد مقامات پر منقول ہے، انھی جوابات میں ایک اسلوب یہ ہے کہ:

﴿وَمَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِذْ قَالُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ عَلَىٰ بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ قُلْ مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ نُورًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ﴾ (الانعام:٩١)

''اور ان لوگوں نے اللہ کو جیسا کہ پہچاننا چاہیے تھا ویسا نہیں پہچانا، جب انھوں نے کہا اللہ نے کسی بشر پر کچھ نہیں اتارا، آپ کہیں جس کتاب کو موسیٰ (علیہ السلام) لے کر آئے تھے، جس میں لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی اس کو کس نے اتارا تھا؟''

موسیٰ علیہ السلام اور ان پر کتاب منزل من اللہ تھی، تو محمد ﷺ بھی اللہ کے رسول اور قرآن اللہ کی کتاب ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام کو بشر ہونے کے باوصف اللہ نبی بنانے پر قادر تھے تو کیا اب محمد ﷺ کو رسول بنانے میں اللہ تعالیٰ قادر نہیں؟ نبی بنانا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے نبی بنا دیتا ہے:

﴿اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ (الحج:٧٥)

''اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے جسے چاہتا ہے رسول منتخب کر لیتا ہے۔''

بلکہ ہر چیز کا اختیار اس کے پاس ہے وہ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا ہے ممتاز ومنتخب کر لیتا ہے:

﴿وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (القصص:٦٨)

''اور تیرا رب جو چاہتا ہے وہ پیدا کرتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے، انسانوں کو اس میں کوئی اختیار نہیں، یہ جنھیں اللہ کا شریک بناتے ہیں اللہ ان سے کہیں بلند و برتر ہے۔''

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے تو ان میں سب سے بہتر ساتویں آسمان کو بنایا، جنت بنائی تو سب سے بہتر جنت الفردوس کو قرار دیا، فرشتے بنائے تو ان میں سب سے افضل حضرت جبریل علیہ السلام کو بنایا، انسان بنائے تو ان میں سب سے افضل انبیائے کرام علیہم السلام کو بنایا اور انبیاء میں اولوالعزم کو منتخب کیا، یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، پھر سب سے افضل و برتر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو۔ امتوں میں سے سب سے افضل آپ ہی کی اُمت کو بنایا، اور اُمت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو، صحابہ میں اصحاب الشجرۃ رضی اللہ عنہم کو، ان میں اصحاب بدر کو، ان میں عشرہ مبشرہ کو، پھر ان میں خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کو اور ان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو۔ زمین میں تمام شہروں سے افضل مکہ مکرمہ اور پھر مدینہ طیبہ کو قرار دیا۔ مہینوں میں چار حرمت والے مہینے بنائے، سب سے افضل رمضان مبارک کو، سال کے دنوں میں یوم النحر کو اور بعض نے کہا: یوم عرفہ کو، سال کی راتوں میں لیلۃ القدر کو۔ انبیاء علیہم السلام پر کتابیں نازل کیں، تو ان میں سب سے افضل قرآن مجید کو، اور قرآن مجید میں سے سورۂ فاتحہ کو۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد کے اوائل میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے۔ شائقین اس میں تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ انسانوں میں سے کسی کو رسول بنانا یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے، یہی بات تمام انبیائے کرام علیہم السلام نے فرمائی:

﴿قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِن نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلَـٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ﴾ (ابراھیم:۱۱)

''ان کے رسولوں نے ان سے کہا: بے شک ہم تو تمھاری طرح ہی بشر ہیں، اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔''

اور انھیں نبوت سے سرفراز فرما دیتا ہے۔ آپ ﷺ سے بھی اعلان کروا دیا:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَـٰهُكُمْ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ﴾ (الکہف:۱۱۰، فصلت:۶)

''کہہ دیجیے کہ میں تمھاری طرح بشر ہوں، مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

﴿قُل لَّوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُم بِهِ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (یونس:۱۶)

''کہہ دیجیے اگر اللہ چاہتا تو میں اس (قرآن) کو پڑھ کر تم کو نہ سناتا اور نہ ہی اس کی کچھ خبر دیتا، بے شک میں اس سے پہلے تم میں طویل عرصہ گزار چکا ہوں کیا تم کو عقل نہیں آتی۔''

میں نے تم میں بچپن گزارا، جوانی گزاری، کاروبار کیا، باہمی معاملات کو نبٹایا، تم نے مجھے صادق و امین کہہ کر پکارا، اس سے پہلے ایسی باتیں کیوں نہ کیں، کیا اب یکا یک (معاذ اللہ) اتنا ماہر اور جھوٹا بن گیا ہوں کہ قرآنِ مجید خود بنا کر تمھارے سامنے کلامِ الٰہی کے نام سے پیش کر دیا ہے، اگر یہ میرا کلام ہے تو اس جیسی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ۔ تعجب کی تب تو کوئی گنجائش تھی جب انسانوں کی راہنمائی کے لیے کسی غیر انسان کو بھیجا جاتا وہ اگر ایسا کلام پیش کرتا جس کی نظیر لانے سے سبھی انسان عاجز آ جاتے، تو وہ کہہ سکتے تھے کہ یہ کلام تو جنسِ غیر سے ہے، ہم ایسا کیونکر کر سکتے ہیں؟ ایک جنس دوسری جنس سے مختلف، ان کے اعمال و افعال مختلف، ان کا دائرۂ اختیار مختلف، اس لیے مقابلہ کیسا؟ لیکن جب یہ کلام اس انسان نے پیش کیا ہے جو عرصۂ دراز تک ان میں رہا، اور وہ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہے، تو

عقل وفکر کی بات یہ تھی کہ وہ تسلیم کر لیتے کہ یہ اس کا کلام نہیں، نہ ہی کسی اور انسان کا ہے، بلکہ اللہ وحدہ لاشریک کا ہے۔ مگر افسوس وہ الٹا تعجب رسول ہونے پر کرتے ہیں، کہ بشر رسول کیونکر ہوسکتا ہے؟ یہ اگر اللہ کے نمائندے ہوتے تو بڑی شان وشوکت ہوتی، مال ودولت ہوتی، اسی تناظر میں انھوں نے کہا:

﴿ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴾
(الزخرف:۳۱)

''یہ قرآن دو بستیوں (مکہ وطائف) کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا؟''

اللہ تعالیٰ نے معاً فرمایا:

''کیا وہ تیرے رب کی رحمت کو تقسیم کرنے والے ہیں۔''

یہ تو اللہ کی عطا اور اس کی محبت ہے جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

ہر دور میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں یہی بات کہی جاتی رہی کہ یہ نبی نہیں، کیونکہ یہ بشر ہیں۔ جیسا کہ سورۃ القمر (۲۴) یٰس (۱۵) الانبیاء (۳) التغابن (۶) بنی اسرائیل (۹۴) میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک سیدھا اور صاف جواب یہ دیا ہے کہ

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَآئِكَةٌ يَمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل:۹۵)

''ان سے کہہ دیں کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے فرشتے ہی کو ان کے لیے رسول بنا کر بھیجتے۔''

اب تم خود فیصلہ کر لو کہ تم کون ہو، تم اگر بشر ہو تو تمھاری ہدایت اور راہنمائی کے لیے ہم نے بشر ہی کو رسول بنایا ہے۔ رسول کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہی تو نہیں، وہ اُمت کے لیے ایک اسوہ اور بہترین نمونہ بھی ہوتا ہے، نوعِ بشر کے لیے بشر ہی نمونہ ہوسکتا ہے، نہ کہ کوئی اور جنس اور نوع۔

انسانیت کا کمال حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سے ہے، نوعِ انسانی کو انھی پر فخر ہے

جس نے جو پایا اور کمال حاصل کیا انھی کی پیروی میں حاصل کیا۔ انبیاے کرام علیہم السلام ہی کو اگر نوعِ انسان سے نکال دیا جائے تو انسان کا اعزاز ہی کیا رہ جاتا ہے؟ مگر افسوس جو نفوسِ قدسیہ انسانیت کا اعزاز تھیں عقل کے پجاریوں نے انھیں نبی اور انسان ماننے سے انکار کر دیا۔ تعجب تو ان کے انکار پر ہونا چاہیے، رسول کے انسان ہونے پر نہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی باعثِ تعجب ہے کہ رسول ماننے والوں میں ایسے عقیدت مند بھی ہوئے جنھوں نے کہا: وہ بشر نہیں، پیغمبر اور رسول تھے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر معاذ اللہ یہ بھی کہا: کہ وہ الٰہ تھے، اللہ کے بیٹے تھے، اللہ نے ان میں حلول فرمایا ہے، اللہ اور رسول میں کوئی فرق نہیں۔ ﴿تعالی اللہ عما یصفون﴾ خلاصہ یہ کہ بشریت و رسالت کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے نزدیک ہمیشہ ایک معما بنا رہا۔

یہ انکار استکبار کا نتیجہ تھا

کفار و معاندین کا رسول تسلیم کرنے سے انکار، ان کے استکبار کا بھی نتیجہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ ان کے تکبر کا ذکر کیا ہے۔ اس آیت میں بھی ﴿منذر منھم﴾ کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ اپنے تکبر کی بنا پر ہی کہتے تھے کہ ہمیں ''ڈرانے'' دھمکانے آیا ہے، ہمیں کون ہوتا ہے یہ ڈرانے والا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ﴿منذر﴾ تو تمام جن و انس کے لیے تھے، بلکہ دعوت و تبلیغ کا پہلا حکم ہی یہی تھا۔

﴿ يَآ اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُo قُمْ فَاَنْذِرْ ﴾

''اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے اٹھو اور ڈراؤ خبر دار کرو''

لیکن آپ کے ڈرانے کا فائدہ انھی کو پہنچا جو قیامت کے دن سے خوف کھاتے اور اللہ کے حضور اپنے حساب کتاب کی فکر رکھتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشَاهَا﴾ (النازعات: ۴۵)

اسی طرح فرمایا:

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْآنٌ مُبِيْنٌ o لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِيْنَ﴾ (يٰسٓ: ۶۹، ۷۰)

''یہ ایک نصیحت ہے اور قرآنِ مبین ہے، تاکہ ہر اس شخص کو ڈرایا جائے جو زندہ ہو اور کافروں پر حجت قائم ہو جائے''

زندہ سے مراد، زندہ قلبی ہے، جس نے سننے اور سوچنے سمجھنے کی قوتوں کو معطل نہیں کر دیا، وہی اس سے مستفید ہوتا ہے، ورنہ کفار تو دل، آنکھیں اور کان رکھنے کے باوجود چارپایوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ اسی سورۂ ق کی آخری آیت یہی ہے:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾

''بس آپ اس قرآن سے ان لوگوں کو ڈرائیں، نصیحت کریں جو عذاب سے ڈرتے ہیں''

کفار کو اس ڈراوے پر بھی تعجب تھا کہ ہمیں ڈراتے ہیں اور ڈراتے بھی قیامت سے ہیں بھلا!

﴿أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَاباً ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيدٌ﴾ (۳)

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور خاک ہو جائیں گے۔ (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے) یہ واپسی (تو عقل سے) بعید ہے''

بلکہ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ تو ہم پر راضی ہے۔ اللہ نے ہمیں انعامات سے نواز رکھا ہے، اس لیے جس عذاب سے ہمیں ڈرایا جاتا ہے، ہم اس کے مستحق نہیں ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ○ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالاً وَّأَوْلَاداً وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ﴾ (سبا:۳۴،۳۵)

''اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والا بھیجا ہو اور اس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہو کہ جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے، انھوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال واولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں۔''

اس لیے وہ اپنے بارے میں بے خوف تھے اور قیامت کا تصور بعید از عقل سمجھتے تھے، سورۃ المؤمنون میں قومِ عاد کے متکبرین کے خیالات کو ذرا تفصیل سے یوں بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ○ وَلَئِنْ أَطَعْتُمْ بَشَراً مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذاً لَّخَاسِرُونَ ○ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَاباً وَعِظَاماً أَنَّكُمْ مُّخْرَجُونَ ○ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ○ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ﴾

(المؤمنون:۳۳۔۳۷)

''اور اس کی قوم کے سرداروں نے کہا جو کافر تھے اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلاتے تھے اور ہم نے دنیا میں انھیں دولت دے رکھی تھی کہ یہ تمھارے جیسا انسان ہی تو ہے، جو کچھ تم کھاتے ہو، وہ بھی وہی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہ پیتا ہے، اور اگر تم ایک بشر کی اطاعت کرو گے، تو بے شک تم نقصان اٹھاؤ گے۔ کیا یہ تمھیں وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مر جاؤ گے اور تم مٹی اور ہڈیاں ہو جاؤ گے تو پھر تم (زمین سے) نکالے جاؤ گے؟ کہیں ایسا ہو سکتا ہے۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے، یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے، یہیں ہم کو مرنا اور جینا ہے، ہم ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔''

وہ صاف صاف کہتے تھے:

اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (الانعام:۲۹)

''کہ جو کچھ بھی ہے بس ہماری ہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم ہرگز مرنے کے بعد نہ اٹھائے جائیں گے۔''

اس سے متعلق دیگر بہت سی آیاتِ مبارکہ ہیں دیکھئے۔ (الصافات:۱۶، الواقعہ:۴۷، الاسراء:۴۹، ۹۸، سبا:۳)

عربی کا شاعر کہتا ہے:

أموت ثم بعث ثم حشر
حديث خرافة يا أم عمر

''کیا موت کے بعد پھر اٹھایا جانا ہے پھر جمع ہونا ہے، اے ام عمر یہ فضول بات ہے۔''

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نجار تھے۔ مشہور صحابی حضرت عمرو بن عاص کے باپ عاص بن وائل نے ان کی مزدوری دینا تھی، حضرت خباب رضی اللہ عنہ اس کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار نہیں کرو گے رقم نہیں دونگا، حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ، تب بھی آپ ﷺ کا دامن نہیں چھوڑوں گا، عاص نے کہا: کیا مر کر زندہ ہونا ہے؟ فرمایا: بیشک، عاص نے کہا: اچھا وہیں میرا مال ہوگا وہی رقم دے دوں گا۔ (بخاری: ۴۷۳۲) یہی عاص بن وائل اور بعض آثار میں ہے کہ ابی بن خلف، قبرستان سے کسی مردہ کی بوسیدہ ہڈی لیے ہوئے آیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے توڑ کر اور اس کے اجزا ہوا میں اڑا کر کہا: اے محمد تم کہتے ہو مردے پھر زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ بتلاؤ ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا۔ جس پر سورۂ یٰس کی آیت (۷۷،۷۸) نازل ہوئیں۔ ابن کثیر (ص ۶۳۹ ج ۳) وغیرہ انھیں اپنی اس فکر پر اس قدر یقین تھا کہ اس پر قسم کھاتے تھے:

﴿وَأَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لاَ يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل: ۳۸)

''اور یہ لوگ اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اللہ کسی مرنے والے کو پھر سے زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا، اٹھائے گا کیوں نہیں؟ یہ تو ایک وعدہ ہے، جسے پورا کرنا اس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

یہاں دو باتیں مزید قابلِ غور ہیں۔

۱۔ کفار نے قیامت کا انکار کسی دلیلِ سمعی پر نہیں، بلکہ محض عقل کی بنیاد پر کیا کہ انسان مر کر مٹی ہو جاتا ہے اور ہڈیوں کا ڈھانچا بکھر جاتا ہے، وہ بھی ہیں جو دریاؤں اور سمندروں میں جانوروں کا لقمہ بن جاتے ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو آگ میں جل کر کوئلہ ہو جاتے ہیں، اور کچھ ایسے بھی ہیں جو درندوں کی خوراک بن جاتے ہیں، ان کو بھلا پھر سے کیونکر اٹھایا جا سکتا ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا انکار بھی اسی عقل پرستی کا نتیجہ تھا کہ بشر رسول کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور توحید کا انکار بھی اسی عقل پرستی کے نتیجے میں تھا۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهاً وَّاحِداً إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ○ وَانْطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰى آلِهَتِكُمْ إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ○

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ﴾ (ص:۵۔۷)

''کیا اس نے سارے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود بنا ڈالا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے اور سردارانِ قوم یہ کہتے ہوئے نکل گئے کہ چلو اور ڈٹے رہو اپنے معبودوں کی عبادت پر یہ بات تو کسی اور ہی غرض سے کہی جا رہی ہے۔ یہ بات ہم نے زمانۂ قریب کی کسی ملت سے نہیں سنی، یہ کچھ نہیں ہے، مگر ایک من گھڑت بات ہے۔''

یعنی عیسائی ہیں، یہودی ہیں، مجوسی ہیں، سبھی اللہ کے پیاروں کو مانتے اور ان کی عبادت کرتے ہیں ان کی نذریں دیتے ہیں ان کو پکارتے اور ان سے اولاد طلب کرتے ہیں، مگر اب یہ نئی بات سن رہے ہیں کہ معبود صرف ایک ہی ہے، گویا توحید، رسالت اور قیامت کا انکار محض عقل کی بنیاد پر ہے، بلکہ بعد کے دور میں قرآنِ مجید کے کلامِ الٰہی ہونے، عذابِ قبر، پل صراط، معراجِ جسمانی، میزان اور وزنِ اعمال کا انکار بھی اسی عقل پرستی کا نتیجہ ہے۔ حکیم مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا:

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

عقل آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کر کے تسلیم و رضا کو مزید پختہ کرنے کے لیے ہے، آیات و احکام کے انکار کے لیے نہیں، بلکہ عقل کا امتحان یہی ہے کہ وہ خود فریبی میں مبتلا ہوتی ہے یا وحی کی تابعداری کرتی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا:

عقل قرباں کن بہ پیش مصطفیٰ
حسبی اللہ گو کہ اللہ ام کفی

عقل کے ان پرستاروں کا زندگی بعد الموت پر جو تردد اور شک تھا یہ بجائے خود عقلمندی کے خلاف ہے۔ دنیا میں جتنے کام انسان کرتا ہے وہ سب کے سب یقینی اور حتمی طور پر نتیجہ خیز اور مفید ہونے کے اعتبار سے ہی نہیں کرتا، بلکہ اکثر و بیشتر کسی معاملے میں شک و تردد ہو تو وہ دیکھتا ہے کہ منفعت کس جانب ہے اگر وہ سمجھتا ہے کہ فائدہ کرنے میں ہے تو

بلاتردد اسے اختیار کر لیتا ہے اور اگر نقصان سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ دیتا ہے، مگر قیامت کا انکار محض تردد اور شک کی بنا پر کیا، حالانکہ عقل وفکر کا تقاضا تو یہ تھا کہ اسے تسلیم کر لیتے۔ کیونکہ اگر قیامت حق ہے، جیسا کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں تو اس کے انکار سے خطرات اور عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا، اس لیے بچاؤ کی یہی صورت ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے اور نبی علیہ السلام کی ہدایت پر عمل کیا جائے، اس راہ میں گو مشقت ہے، لیکن نفع سے خالی نہیں، اس لیے عقل کی بنیاد پر قیامت کا انکار بجائے خود عقلمندی کا ثبوت نہیں۔

(۲) کفار نے قیامت کا انکار کیا اور اس کے قیام کو عقل وفکر کی بنا پر محال اور ناممکن قرار دیا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اجزائے ایمان میں ایک اہم جز قرار دیا ہے، عقائد کے بنیادی تین اصول جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام میں قدرِ مشترک رہے ہیں ان میں ایک یہی آخرت پر ایمان ویقین ہے، قیامت پر ایمان دراصل اصلاحِ احوال واعمال اور معصیت وجرائم کے سامنے ایک آہنی دیوار ہے، دنیا میں پائدار امن اس عقیدہ کے بغیر ممکن نہیں، انسان کی ظاہری اور باطنی حالت کی اصلاح، اس کی خلوت وجلوت میں یکسانیت، اللہ پر ایمان اور عقیدۂ آخرت کی بنا پر ہی ہو سکتی ہے۔ اسی عقیدہ پر یقین وعمل سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی دنیا بدل گئی، اور اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکیزہ معاشرہ وجود میں آیا کہ اس سے بہتر معاشرہ چشمِ فلک نے نہ اس سے پہلے دیکھا نہ ہی اس کے بعد۔ جرائم کے انسداد اور معاشرے کی اصلاح کے لیے قانون بنتے ہیں، سزائیں مقرر ہوتی ہیں، مگر جرائم ہیں کہ ان کے خاتمے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، کوئی بھی اپنے منصب کی ذمہ داری اور اس کا فریضہ ادا نہیں کرتا، کوئی معاملہ اور محکمہ دھوکہ، فریب، جھوٹ، کرپشن، رشوت اور چوری سے محفوظ نہیں۔ یہ سب ایسا کیوں ہے؟

اس لیے کہ دلوں میں اللہ جل جلالہ کا ڈر نہیں رہا اور آخرت کی جواب دہی سے ہم بے خوف ہو چکے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے غلام اور شاگردِ رشید حضرت نافع رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ ہم حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ مدینۂ طیبہ سے باہر تھے، ساتھیوں نے

کھانا تیار کیا، دستر خوان پر لگایا، ہم کھانا کھانے لگے تو ایک چرواہا ادھر آ نکلا۔ اس نے سلام کہا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اسے بھی کھانے کی دعوت دی، مگر اس نے کہا: کہ میرا روزہ ہے، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بڑے تعجب سے فرمایا: گرمی کے ایام میں روزہ بھی ہے اور بکریاں بھی چرا رہے ہو، اس نے کہا: اللہ کی قسم میں اپنے فراغت کے ایام کو غنیمت جانتا ہوں، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اس کا امتحان لینا چاہا، اسے فرمایا: اپنی بکریوں سے ایک بکری ہمیں فروخت کر دو، ہم اس کا گوشت بھی تمھیں دیں گے، اس سے تم اپنا روزہ افطار کر لینا، مگر اس نے کہا: کہ یہ بکریاں میری نہیں، بلکہ میرے مالک کی ہیں، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امید ہے کہ ایک بکری کے گم ہو جانے پر تیرا مالک کوئی پرواہ نہیں کرے گا، اگر کوئی بات ہو تو تم کہہ دینا بکری بھیڑیا لے گیا تھا، اس نے کہا: فأین اللّٰہ پھر اللہ کہاں ہے؟ وہ با آوازِ بلند یہ کہتا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتا تھا، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب مدینۂ طیبہ واپس پلٹے تو اس چرواہے کے مالک سے ملے، اس سے چرواہے کو بکریوں سمیت خرید کر آزاد کر دیا اور بکریاں اسے ہبہ کر دیں۔ (طبرانی، شعب الایمان، السیر: ص ۲۱۶ ج ۳)

امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حکم جاری کر دیا کہ خبردار کوئی بھی اشیائے خوردنی میں ملاوٹ نہ کرے، ایک رات آپ چوکیداری کرتے ہوئے مدینۂ طیبہ کے اطراف میں نکل گئے، رات گئے جب تھک کر چور چور ہو گئے تو ایک گھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ گھر سے آواز آئی کہ ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی ہے اٹھو دودھ میں پانی ملا دو، بیٹی بولی: اماں تمھیں معلوم نہیں امیر المؤمنین نے بڑی سختی سے منع کیا ہے کہ دودھ میں پانی نہ ملاؤ، بوڑھی ماں نے کہا: بیٹی دودھ میں پانی ملا دو تم ایسی جگہ پر ہو جہاں تمھیں عمر رضی اللہ عنہ یا عمر رضی اللہ عنہ کا کوئی کارندہ نہیں دیکھ رہا، بیٹی بولی: ماں اگر عمر رضی اللہ عنہ نہیں دیکھتا تو عمر رضی اللہ عنہ کا اللہ تو ہمیں دیکھ رہا ہے، میں دودھ میں ہرگز پانی نہیں ملاؤں گی۔ (شذرات الذهب: ص ۱۱۹ ج ۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ اونٹ کا سامان و پالان کندھے پر رکھے جا رہے ہیں، میں نے کہا: امیر المؤمنین آپ کہاں جا رہے ہیں، انھوں نے فرمایا: صدقہ کا ایک اُونٹ بھاگ گیا ہے میں اس کو پکڑنے کے لیے جا رہا ہوں۔ میں نے کہا: امیر

المومنین آپ نے تو اپنے بعد ہونے والے خلفاء کو ذلت میں ڈال دیا، انھوں نے فرمایا: اے ابوالحسن رضی اللہ عنہ! مجھے ملامت نہ کرو۔

وَالَّذِیْ بَعَثَ مُحَمَّداً بِالنُّبُوَّةِ لَوْ أَنَّ عَنَاقاًذَهَبَتْ بِشَاطِيْ الْفُرَاتِ لَأُخِذَ بِهَا عُمَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (ازالۃ الخفاء: ص ۲۸۴ ج ۳)

''قسم ہے اس ذات کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی بنایا اگر ایک بکری کا بچہ بھی فرات کے کنارے پر ضائع ہو گیا تو قیامت کے دن اس پر عمر رضی اللہ عنہ پکڑا جائے گا۔''

یہ ہے قیامت پر ایمان ویقین کا نتیجہ، لیکن انسان جب آخرت کی جواب دہی سے بے پرواہ ہو جاتا ہے تو انسان نہیں وحشی اور درندہ بن جاتا ہے۔ حرص وہوا میں پھنس کر بھیڑیے کا کردار ادا کرتا ہے۔ أعاذنا الله منه

کفار بھی قیامت کا انکار کرتے اور اپنی عیش وعشرت کی زندگی میں اس پر ایمان کو رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ﴾ (المطففین: ۱۲)

''اور اس کو بس وہ جھٹلاتا ہے جو حد سے گزرنے والا گناہوں میں پڑا ہوا ہے۔''

اسی قماش کے لوگوں کا کہنا ہے۔

بابر با عیش گوش کہ عالم دوبارہ نیست

چنانچہ ان کی ساری تگ ودو دنیا سنوارنے اور اسے حاصل کرنے میں ہوتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی طلب وتڑپ میں جو کچھ سعی وکوشش کرتا ہے اس کے بارے میں سمجھتا ہے کہ یہ سب اچھا ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے بدنصیبوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالاً ٥ الَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعاً ٥﴾

(الکھف: ۱۰۴، ۱۰۵)

''اے نبی ﷺ! ان سے کہو: کیا میں تمھیں بتاؤں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ خسارہ پانے والا کون ہے؟ وہ لوگ جن کی ساری جدوجہد دنیا کی زندگی ہی کے لیے گم ہوگئی اور وہ سمجھتے رہے کہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں۔''

یہ دنیا تو تھی آخرت بنانے اور سنوارنے کے لیے، مگر انھوں نے سمجھا کہ دنیا کی زندگی ہی اصل زندگی ہے، اور کچھ وہ بھی ہیں جو آخرت کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر جو کچھ کرتے ہیں اللہ سبحانہ کی رضا اور آخرت میں کامیابی کے لیے نہیں، بلکہ دنیا میں نام پانے کے لیے کرتے ہیں۔ مثلاً ہسپتال بناتے ہیں، خیراتی ادارے تعمیر کرتے ہیں، ویلفیئر کے بڑے بڑھ چڑھ کر کام کرتے ہیں، اور پھر ناموں کی تختیاں نصب کرواتے ہیں، اور اپنے ان عزائم کی تکمیل کے لیے کونسل اور اسمبلی اور دیگر اداروں کی ممبری کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کمایا ہوا مال بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ سیاست کو عبادت سمجھتے ہیں، اور خدمتِ خلق غریب پروری کے دلفریب نعروں میں مگن رہتے ہیں۔ اور جس عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا کیا ہے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، یہی لوگ اس آیت کا مصداق ہیں اور بہت کچھ کرنے کے باوجود گھاٹے اور نقصان میں ہیں۔ دنیا کے انھی مقاصد اور مراتب کو حاصل کرنے کے لئے انسان حلال وحرام، جائز وناجائز کی تمیز ختم کر دیتا ہے، بلکہ دوسرے انسانوں کی جان ومال کو ضائع کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا، لیکن جو خوش نصیب اپنی فکر، آخرت بنالیتا ہے، وہ ہر نوع **فساد فی الأرض** سے بچ جاتا ہے۔ اور دنیوی کھوکھلے نعروں کو چھوڑ کر عمل وتقویٰ کی زندگی اختیار کرتا ہے، جھوٹ، فریب، دھوکہ سے بچ کر صدق وصفائی سے اپنے معاملات کو پورا کرتا ہے، اور یوں اس کی دنیا صاف ستھری ہو جاتی ہے اور آخرت بھی سنور جاتی ہے۔

﴿قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ وَعِنْدَنَا كِتَابٌ حَفِيظٌ﴾ (۴)

''تحقیق ہم جانتے ہیں جو کچھ ان میں سے زمین کھا جاتی ہے اور ہمارے پاس کتاب ہے جس میں سب کچھ محفوظ ہے۔''

یہ کفار کے پہلے شبہ کا جواب ہے کہ بے شمار انسانوں کے اجسام جو زمین میں دفن ہو کر مٹی میں مل گئے ہیں، ان کے اعضاء معلوم نہیں کہاں کہاں ہیں، خاکی اجزا خاک میں مل گئے، دریا یا پانی میں ڈوب کر مر گیا تو دریائی جانوروں کا جزوِ بدن بن گیا، درندوں نے چیر پھاڑ کھایا تو وہ بھی کئی جانوروں کے جسم کا حصہ بن گیا، جل مرا تو اس کی راکھ فضا میں بکھر گئی، اس لیے ان تمام انسانوں کا از سرِ نو حشر ونشر بعید از عقل ہے۔ جواباً فرمایا گیا ہے: کہ یہ بات اگر تمھاری عقل وفکر سے بعید ہے اور تمھاری اس حوالے سے معلومات بالکل نہ ہونے کے برابر ہیں، تو کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب معلومات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی دسترس سے بھی باہر ہیں؟ ہرگز ہرگز نہیں، انسان مٹی میں دفن ہو کر مٹی ہو جائے، زمین پر سیکڑوں انقلابات آ جائیں، تب بھی یہ ساری حالتیں اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔ انسانی اعضا خواہ کتنے ہی پراگندہ ہو کر بکھر جائیں، وہ جہاں کہیں بھی ہیں اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، اللہ تعالیٰ جب چاہیں گے انھیں جمع کر کے انسان کو دوبارہ زندہ کر لیں گے اور یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے علم کے علاوہ اس کے پاس ایک ایسی عظیم الشان کتاب ''لوح محفوظ'' ہے، جس میں سب کچھ محفوظ ہے، تمام واقعات کی محافظ اور ان کا ریکارڈ رکھے ہوئے ہے، اور اس کارخانۂ عالم کے تمام حالاتِ کلی وجزوی، اجمالی وتفصیلی اس میں درج ہیں۔

''حفیظ'' کے معنی میں یہاں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ یہاں ''محفوظ'' مراد ہے کہ

وہ کتاب تغیر وتبدل اور کاٹ چھانٹ سے محفوظ ہے، اور دوسرا یہ کہ یہاں بمعنی ''حافظ'' ہے کہ یہ کتاب ان (موتی کے) تمام احوال وظروف کی حافظ ہے، اور یہ لفظ قرآنِ مجید میں اسی معنی میں مستعمل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ اللَّهُ حَفِيظٌ عَلَيْهِمْ﴾

(الشوریٰ:٦)

''اور جنھوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنا کارساز بنالیا ہے اللہ ان سب کا نگہبان ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾

(یوسف:٥٥)

''زمین کے خزانوں کا انتظام میرے سپرد کر دیں میں ان کی خوب نگرانی کرنے والا (حساب کتاب) جاننے والا ہوں۔''

گویا خبردار کیا گیا ہے کہ جس طرح یہ کتاب تمام جزئیات کی حافظ ونگہبان ہے اسی طرح میں بھی ایک ایک جزئی کو جانتا ہوں، کوئی چیز میری معلومات سے خارج نہیں۔

قرآنِ مجید میں ان دونوں پہلوؤں سے تمام اجزا کے علم کا تذکرہ دیگر آیات میں بھی موجود ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ (الملک:١٤)

''کیا وہ نہیں جانتا کہ جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے وہ تو بڑا باریک بین خبردار ہے۔''

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ ○ الَّذِي جَعَلَ لَكُم مِّنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ نَارًا فَإِذَا أَنتُم مِّنْهُ تُوقِدُونَ ○ أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ

مِثْلَهُم بَلٰى وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾ (یٰس :۷۹، ۸۰، ۸۱)

''اے نبی ﷺ کہو، ان (بوسیدہ ہڈیوں) کو وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے انھیں پیدا کیا، اور وہ تخلیق کا ہر کام جانتا ہے، وہی جس نے تمھارے لیے ہرے بھرے درخت سے آگ پیدا کر دی اور تم اس سے اپنے چولہے روشن کرتے ہو، کیا وہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر نہیں ہے کہ ان جسموں کو (دوبارہ) پیدا کر سکے؟ کیوں نہیں، جبکہ وہ ماہر پیدا کرنے والا خوب جاننے والا ہے۔''

﴿وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۝ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾ (الحجر:۸۵، ۸۶)

''اور بے شک قیامت ضرور آنے والی ہے آپ اچھی طرح درگزر کریں، بے شک آپ کا رب سب کو پیدا کرنے والا جاننے والا ہے۔''

ان آیات میں منکرینِ قیامت کے جواب میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفتِ خالقیت کے ساتھ صفت علیم وخبیر کا ذکر اسی تناظر میں ہے کہ وہ خوب جانتا ہے، اس سے کوئی ذرہ بھی چھپا ہوا نہیں، جب چاہے گا تمام ذرات کو جمع ہونے کا حکم دے گا اور وہ اسی طرح دوبارہ انسان بن جائے گا جس طرح پہلے بنایا گیا تھا۔

انسان کے اس ریکارڈ کے بارے میں محفوظ ہونے کا ذکر بھی جابجا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ إِلَّا فِيْ كِتَابٍ﴾ (فاطر:۱۱)

''نہ کسی عمر والے کو زیادہ عمر ملتی ہے اور نہ ہی کسی کی عمر کم کی جاتی ہے۔ مگر (یہ سب) لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔''

اسی طرح فرمایا گیا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ

مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (ھود:٦)

''اور زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو، اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے اور کہاں سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔''

انسان ہی نہیں، زمین پر ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر تر کیڑے کے رہنے کی جگہوں کو بھی جانتا ہے، کہ وہ شکمِ مادر سے لیکر کس بل میں، کس پتھر میں اور کس گھونسلے میں رہ رہا ہے، یہ بھی جانتا ہے کون کہاں کب تک رہے گا اور دوسری جگہ اپنا بسیرا کب بنائے گا، اس علیم وخبیر کو یہ سب معلوم ہونے کے ساتھ ساتھ، یہ سب معلومات کتابِ مبین میں بھی محفوظ ہیں۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾

(سبا:٣)

''اور کافر کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی، آپ کہہ دیجئے میرے عالمِ غیب رب کی قسم! ضرور آئے گی، اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں، نہ ذرے سے بڑی اور نہ ہی چھوٹی، یہ سب کچھ کتابِ مبین میں درج ہے۔''

اللہ تعالیٰ کے علمِ ذاتی کے علاوہ لوحِ محفوظ میں ہر چیز کے محفوظ ہونے کا ذکر ایک اور جگہ یوں بیان ہوا ہے:

﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ (الانعام:٥٩)

''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر وبر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے، درخت سے گرنے والا کوئی پتہ

ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو،، زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو، خشک وتر سب کچھ ایک کتابِ مبین میں درج ہے''

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اسے فرمایا لکھ، اس نے عرض کیا میں کیا لکھوں؟ اللہ نے فرمایا جو ہو چکا اور جو کچھ آئندہ ہوگا، سب لکھ۔'' (ترمذی: رقم ۲۱۵۵)

صحیح مسلم (رقم: ۶۷۴۸) میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے بارے میں اپنے فیصلے زمین اور آسمانوں کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل ثبت فرمادیے تھے۔

اسی کتابِ مبین اور لوحِ محفوظ میں سارا ریکارڈ محفوظ ہے، ریکارڈ کا یہ دفتر زمانہ جاہلیت میں تو شاید کسی کو سمجھ میں نہ آتا ہو، مگر موجودہ سائنسی انکشافات اور کمپیوٹر سی ڈیز سے جو باتیں دیکھنے، سننے میں آرہی ہیں اس کے بعد اس کا انکار محض ہٹ دھرمی اور عناد پر مبنی ہے۔

احادیث مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان جہاں بھی دفن ہو یا جہاں اس کا مقدر ہو وہاں پہنچ کر انسان تو ختم ہو جاتا ہے، مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی محفوظ رہتی ہے اسی سے انسان کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا، چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ مِنَ الْإِنْسَانِ شَيْءٌ إِلَّا يَبْلٰى إِلَّا عَظْمٌ وَاحِدٌ وَهُوَ عَجْبُ الذَّنَبِ وَمِنْهُ يُرَكَّبُ الْخَلْقُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (مسلم: رقم ۷۴۱۴)

یہ عمومی حکم ہے، مگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے جس اپنے بندے کا جسدِ خاکی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں وہ محفوظ رہتا ہے، مٹی اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، انبیائے کرام علیہم السلام کے بارے میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ.

(ابوداود: رقم ۱۰۴۷، عن أوس بن أوس رضی اللہ عنہ)

''اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے اجساد کو حرام قرار دیا ہے۔'' انبیائے کرام کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کا چاہیں جسدِ خاکی باقی رکھنے پر قادر ہیں۔ عامۃ الناس کے بارے میں یہی حکم ہے کہ ریڑھ کی ہڈی کے علاوہ ان کے اجساد محفوظ نہیں رہتے، اسی سے انسان کو اللہ تعالیٰ دوبارہ پیدا کریں گے، جس طرح درختوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج زمین میں پیوست ہو جاتے ہیں اور وقت آنے پر وہ زمین سے نکلتے ہیں اور زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ اسی طرح اس ریڑھ کی ہڈی سے وقتِ موعود پر انسان پیدا ہو کر اٹھیں گے، یہ سب کچھ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں۔

﴿بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِي أَمْرٍ مَّرِيجٍ﴾ (۵)

''بلکہ ان کے پاس جس وقت حق آیا اسی وقت انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔
پس وہ تو صریح تذبذب کا شکار ہیں۔''

اس آیت میں ان کی شناعت اور بدبختی کو اور کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ منکرین نے رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے پر تعجب کا اظہار ہی نہیں کیا، بلکہ آگے بڑھ کر ان کی تکذیب کی اور بلا تأمل انھیں معاذ اللہ جھوٹا قرار دیا، جن کے بارے میں یہ آج تک متفق رہے کہ محمد ﷺ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں، جنھیں یہ صادق وامین کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر جوں ہی انھوں نے حق وسچ پر مبنی دعوت دی، تو انھوں نے غور وفکر کرنے اور اسے تسلیم کرنے کی بجائے فی الفور کہہ دیا کہ محمد ﷺ جھوٹا ہے اور جھوٹ کہتا ہے۔ معاذ اللہ

''حق'' سے مراد یہاں رسول اللہ ﷺ ہیں۔ یعنی رسول کی اسی تکذیب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کہ منکرین پر ان کی سیاہ کاریوں کی وجہ سے دنیا میں مؤاخذہ ہو تو وہ کہیں گے، کہ اگر ہماری راہنمائی کے لیے رسول آتا تو ہم اس کی دعوت قبول کر لیتے، مگر

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِندِنَا قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ﴾ (القصص: ۴۸)

''جب ان کے پاس حق، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ ہماری طرف سے آئے، تو وہ کہنے لگے، کہ انھیں ایسے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جیسے موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے؟''

لیکن کیا موسیٰ علیہ السلام کے ان معجزات کو دیکھ منکرین موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آئے

تھے؟ ہرگز نہیں، تو یہ محض اہلِ مکہ عذرِلنگ اور بہانہ بازی ہے۔

سورۂ ص میں یہی بات یوں فرمائی گئی ہے:

﴿وَعَجِبُوْا أَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُوْنَ هٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ﴾ (ص:۴)

''انھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ ایک ڈرانے والا خود انھی میں سے آگیا اور کافر کہنے لگے یہ ساحر ہے بہت جھوٹا ہے۔''

یہی بات قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کے بارے میں کہی:

﴿أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ﴾ (القمر:۲۵)

''کیا ہمارے درمیان یہی ایک رہ گیا تھا جس پر اللہ کا ذکر نازل کیا گیا ہے، بلکہ یہ تو جھوٹا اور برخود غلط ہے۔''

اسی نوعیت کی بات کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی کہتے کہ اسی یتیم کے گھر قرآن نازل ہونا تھا، یہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں ہوا۔ (الزخرف:۳۱)

یا ''الحق'' سے یہاں مراد قرآنِ مجید ہے کہ جب ان کے پاس یہ کتابِ مبین آئی تو انھوں نے اس پر غور وتدبر کرنے کی بجائے اسے جھوٹا قرار دیا، اس کے منزل من اللہ ہونے کا انکار ان کی ضد کا نتیجہ تھا، اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو خود عرب اپنی تمام ترادبی لن ترانیوں کے اس کی نظیر لانے سے عاجز نہ رہتے، اگر وہ اس پر غور وفکر کرتے تو جنات کی طرح وہ بھی تسلیم کرتے کہ

﴿إِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا أُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ إِلَى الْحَقِّ﴾ (الاحقاف:۳۰)

''ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل کی گئی ہے، اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اور حق کی رہنمائی کرتی ہے۔''

مگر انھوں نے تو اس کتابِ مبین پر کان دھرنے کی بجائے یہ روش اختیار کی کہ:

﴿ لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ ﴾

(حٰمٓ السجدۃ:٢٦)

"اس قرآن کو ہرگز نہ سنو اور جب پڑھا جائے تو اس میں خلل ڈالو شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ"

اس لیے ان کی یہ تکذیب دونوں پہلوؤں پر تھی۔

"الحق" سے یہاں بعض حضرات نے قیامت مراد لی ہے، مگر ﴿لَمَّا جَآءَهُمۡ﴾ کا لفظ اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں قیامت مراد نہیں، بلکہ رسول یا قرآن مراد ہے، اور قیامت جب آئے گی تو وہ کہیں گے: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحۡمٰنُ وَصَدَقَ الۡمُرۡسَلُوۡنَ﴾ (یٰسٓ:٥٢) کہ یہ ہے جس کا رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور سچ فرمایا تھا انبیاء نے۔

سیاقِ کلام کے اعتبار سے پہلی بات ہی راجح معلوم ہوتی ہے۔ اور اس کا سورۂ صٓ میں بھی ذکر ہے کہ یہاں مراد رسول اللہ ﷺ کی تکذیب ہے۔ ﴿فَهُمۡ فِيۡۤ اَمۡرٍ مَّرِيۡجٍ﴾ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ کہ وہ اس معاملے میں بڑے تذبذب اور انتشار کا شکار ہیں۔ ﴿مَرِيۡجٍ﴾ کے معنی خلط ملط، گڈمڈ کرنے اور ملا دینے کے ہیں۔ اسی سے المروج ہے۔ جس کے معنی اختلاط اور مل جانے کے ہیں۔ عرب کہتے ہیں: مَرَجَ أَمْرُهُمْ کہ ان کا معاملہ ملتبس ہوگیا۔ سورۃ الرحمٰن میں ہے: ﴿مَرَجَ الۡبَحۡرَيۡنِ يَلۡتَقِيٰنِ﴾ (الرحمٰن:١٩) "اس نے کھاری اور شیریں دو دریا جاری کیئے کہ آپس میں باہم مل جاتے ہیں۔" یہاں بھی مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں وہ کوئی فیصلہ کن رائے نہیں رکھتے، بلکہ آپ کے بارے میں مختلف ہیں اور تضاد کا شکار ہیں، کبھی آپ کو شاعر کہتے ہیں، کبھی کاہن قرار دیتے ہیں، کبھی مجنون کہتے ہیں، تو کبھی ساحر کہتے ہیں، بلکہ کبھی کہتے ہیں کہ ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ اس کے پسِ پردہ کوئی اور ہے جو اسے یہ کلام بنا سنوار کر دیتا ہے، کبھی کہتے ہیں کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ بھی کہتے ہیں کہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے سردار کو نبی بنایا ہوتا، گویا یہ آپ کے بارے میں ایسی ذہنی الجھن میں پھنسے ہوئے ہیں، جس سے ان کا نکلنا بہت مشکل ہے۔

اگر ''الحق'' سے مراد قرآنِ مجید ہے تو اس کے بارے میں بھی وہ الجھن کا شکار تھے۔ کبھی اسے ''سحرِ مبین'' سے تعبیر کرتے تو کبھی اسے ''قولِ شاعر'' قرار دیتے اور کبھی اسے ''قولِ کاہن'' کہتے تھے۔

امام رازی رحمہ اللہ نے اس کی بجائے فرمایا ہے کہ: یہ مذکورہ آیات ان کی مختلف آرا کے متعلق ہیں کہ اِنَّھُمْ شَکُّوْا فِیْکَ، بَلْ عَجِبُوْا بَلْ کَذَّبُوْا'' انھوں نے آپ کے بارے میں شک کا اظہار کیا، بلکہ اس پر تعجب کا اظہار کیا، بلکہ اس کی تکذیب کی۔'' یوں ان کی گویا تین حیثیتیں یا تین درجے تھے۔ پہلا شک، اس کے اوپر تعجب کہ شک میں ازالہ اور تبیین کی توقع ہوتی ہے، جبکہ تعجب میں دراصل عدمِ وقوع کا تصور ہوتا ہے، اور اس کے واقع ہونے پر انسان متعجب ہوتا ہے۔ مگر تکذیب میں عدمِ وقوع کا یقین ہوتا ہے، اس لیے اسے حتماً جھٹلا دیتا ہے۔ پہلا درجہ شاکین کا، دوسرا ظانین کا اور تیسرا جازمین کا۔ ان کے اسی تردد کو ﴿مَرِیْجٍ﴾ سے تعبیر کیا گیا۔

بلکہ یہ بات تو بدیہی اور روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ جو قرآنِ مجید اور حاملِ قرآن کی تکذیب کرتے ہیں وہ ہمیشہ تضادِ فکری میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور انھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

﴿اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ﴾ (الذاریت:۸)

''تمھاری بات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔''

مولانا مودودی رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا ہے: ''کہ تم لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہو اور ہر ایک کی بات دوسرے سے مختلف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا ازلی وابدی ہے اور کوئی قیامت برپا نہیں ہوگی، کوئی کہتا ہے کہ یہ نظام حادث ہے اور ایک وقت میں یہ جا کر ختم بھی ہوسکتا ہے، مگر انسان سمیت جو چیز بھی فنا ہوگی پھر اس کا اعادہ ممکن نہیں ہے۔ کوئی اعادے کو ممکن مانتا ہے، مگر اس کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کے اچھے اور برے نتائج بھگتنے کے لیے بار بار اسی دنیا میں جنم لیتا ہے۔ کوئی جنت اور جہنم کا بھی قائل ہے، مگر اس کے ساتھ تناسخ کو بھی ملاتا ہے، یعنی اس کا خیال یہ ہے کہ گنا ہگار جہنم میں بھی سزا

بھگتتا ہے اور پھر اس دنیا میں بھی سزا پانے کے لیے جنم لیتا رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا کی زندگی خود ایک عذاب ہے، جب انسان کے نفس کو مادی زندگی سے لگاؤ باقی رہتا ہے اس وقت تک وہ اس دنیا میں مرمر کر پھر جنم لیتا رہتا ہے اور اس کی حقیقی نجات یہ ہے کہ وہ بالکل فنا ہو جائے۔ کوئی آخرت اور جنت و جہنم کا قائل ہے، مگر کہتا ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو صلیب پر موت دے کر انسان کے ازلی گناہ کا کفارہ ادا کر دیا ہے، اور اس بیٹے پر ایمان لا کر آدمی اپنے اعمالِ بد کے برے نتائج سے بچ جائے گا۔ پھر کچھ دوسرے لوگ آخرت اور جزا و سزا، ہر چیز کو مان کر بعض ایسے بزرگوں کو شفیع تجویز کر لیتے ہیں جو اللہ کے ایسے پیارے ہیں، یا اللہ کے ہاں ایسا زور رکھتے ہیں کہ جو ان کا دامن گرفتہ ہو وہ دنیا میں سب کچھ کر کے بھی سزا سے بچ سکتا ہے۔ ان بزرگ ہستیوں کے بارے میں بھی اس عقیدے کے ماننے والوں میں اتفاق نہیں ہے، بلکہ ہر ایک گروہ نے اپنے الگ الگ شفیع بنا رکھے ہیں۔ یہ اختلافِ اقوال خود ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ وحی و رسالت سے بے نیاز ہو کر انسان نے اپنے اور اس دنیا کے انجام پر جب بھی کوئی رائے قائم کی ہے، علم کے بغیر قائم کی ہے، ورنہ اگر انسان کے پاس اس معاملہ میں فی الواقع براہِ راست علم کا کوئی ذریعہ ہوتا تو اتنے مختلف اور متضاد عقیدے پیدا نہ کرتا۔'' (تفہیم: ص ۱۳۵ ج ۵)

یہ اختلاف انسان اور دنیا کے انجام کے بارے میں ہی نہیں، دنیا میں زندگی گزارنے اور اس کے طریقۂ کار میں بھی اختلاف ہے۔ اگر کوئی نظام سرمایا داری کا قائل ہے تو کوئی سوشلزم کا دم بھرتا ہے۔ کوئی جمہوریت کا نام لیوا ہے تو کوئی ڈکٹیٹرشپ کا خواہاں ہے۔ کوئی وطن پرستی کا داعی ہے تو کوئی قوم اور رنگ و نسل کا گرویدہ ہے۔ گویا یہ سب امر مریج اور قول مختلف کا شکار ہیں۔ اور کل حزب بما لدیهم فرحون کا مصداق ہیں۔ مگر ایک مومن صادق اور وحی و رسالت کو صحیح معنوں میں تسلیم کرنے والا ایمان و یقین کی زندگی گزارتا ہے۔ اس کے معتقدات میں تردد اور تعدد کا کوئی تصور نہیں ہے۔ وہ ایک ہی صراطِ مستقیم کو اختیار کرتا ہے۔ اور اسی پر گامزن رہتا ہے۔

﴿أَفَلَمْ يَنظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنَاهَا وَزَيَّنَّاهَا وَمَا لَهَا مِن فُرُوجٍ﴾ (٦)

''کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اس کو بنایا اور اس کو آراستہ کیا اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں۔''

پہلی آیت میں قیامت کے برحق ہونے پر اللہ تعالیٰ کے علمِ کامل کا بطورِ دلیل ذکر ہے اور اس آیت میں قدرتِ کاملہ کے حوالے سے دلیل کا تذکرہ ہے، کہ کبھی انھوں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کس طرح بنایا اور رات کو اسے چاند ستاروں اور دن کو آفتاب کی روشنی میں نیلگوں رنگ سے سجایا ہے۔ یہ اتنی بلندی پر چھت اور اس قدر وسیع وعریض کہ جس کے طول وعرض کا آج تک اندازہ نہیں ہو سکا۔ پھر یہ دو چار برس کا قصہ نہیں، بلکہ حضرتِ انسان کی پیدائش سے سال ہا سال پہلے یہ آسمان بنایا، جس کے بارے میں ماہرینِ فلکیات کا اندازہ ہے کہ روشنی کی رفتار کے مطابق تیز ترین ہوائی جہاز جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار پر چلے، وہ آسمان کے گرد چکر لگائے تو اس ہوائی جہاز کو آسمان کا چکر لگانے میں ایک ارب سال لگیں گے، ایسا وسیع وعریض آسمان بغیر ستونوں کے بنا دیا۔ اس میں ابھی تلک کوئی خلل واقع نہیں ہوا، اس میں کوئی شکن نہیں پڑی، انسانوں کی بنائی ہوئی چھتیں ستونوں کے بغیر بنتی نہیں، پرانی ہو جائیں تو ان کا رنگ وروپ بگڑ جاتا ہے۔ چھت کمزور ہو جاتی ہے۔ بار بار کی ریپیرنگ کے باوجود بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ مگر آسمان ہے کہ نہ اس کا رنگ وروغن بدلا، نہ اس کی خوبصورتی میں فرق آیا، شکست وریخت تو کجا ابھی تلک اس میں کوئی شکن نہیں پڑی، جس طرح روزِ اول کو تھا آج بھی بدستور اسی طرح ہے، اور جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا اسی طرح رہے گا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ قدرتِ کاملہ ہے تو اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کیونکر

مشکل ہے؟ جو عرصہ دراز سے آسمان، اس کی زیب و زینت کا نگہبان اور محافظ ہے اس کے لیے انسان کے مرنے کے بعد اس کے اجزائے ترکیبیہ کو محفوظ کرنا ناممکن کیوں ہے؟ آسمان کے مقابلے میں انسان کی حیثیت ہی کیا؟ ﴿ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا﴾ (النازعات:۲۷) کیا تمھاری تخلیق زیادہ سخت کام ہے یا آسمان کی؟ جو قادرِ مطلق یہ آسمان بنا سکتا ہے، بلکہ پورے عالمِ بالا میں بے شمار ستارے، سیارے، کہکشائیں بنانے پر قادر ہے، اس کے لیے مشتِ خاک سے بنے ہوئے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا کونسا مشکل ہے؟

﴿لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (المؤمن:۵۷)

''بے شک آسمان اور زمین پیدا کرنا انسانوں کے پیدا کرنے سے کہیں بڑا کام ہے، مگر اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔''

اسی طرح سورۂ یٰس میں فرمایا:

﴿اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰى ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ﴾ (یٰس:۸۱)

''کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اس پر قادر نہیں کہ ان جسموں کو دوبارہ پیدا کر دے؟'' کیوں نہیں، وہ بڑا خالق ہے (تخلیق کا کام) خوب جانتا ہے۔''

اسی طرح سورۃ الاحقاف میں فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (الاحقاف:۳۳)

''کیا انھوں نے اتنا نہیں سمجھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بنایا اور ان کے بنانے میں وہ نہیں تھکا وہ اس پر قادر ہے کہ مردوں کو دوبارہ زندہ کر لے۔ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آسمان کی تخلیق انسان کی تخلیق سے کہیں بڑا کام ہے، انسان میں سوراخ ہیں، اس میں کئی تفاوت ہیں، مگر آسمان میں کوئی تفاوت نہیں، جب انسان اس حقیقت کو سمجھتا ہے اور اس پر سر دھنتا ہے تو اس سے کم تر انسان کے دوبارہ پیدا ہونے کو وہ مستبعد کیوں سمجھتا ہے؟

آسمان کی زینت دن اور رات میں مختلف ہے، یہی اختلاف لیل ونہار کا باعث ہے۔ رات آنے پر دن کا نظارہ ختم ہو جاتا ہے، اور آسمانِ دنیا ستاروں سے جگمگا اٹھتا ہے۔ مگر طلوعِ فجر سے ان ستاروں کی روشنی آہستہ آہستہ ماند پڑ جاتی ہے اور نیّرِ تاباں کے طلوع ہونے پر سب ستارے گویا ختم ہو جاتے ہیں، یہ نظام ایک عرصۂ دراز سے یوں ہی جاری وساری ہے۔ جو قادرِ مطلق روز مرہ کے اس انقلاب اور اعادہ پر قادر ہے وہ انسان کے ختم ہونے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔

''الحق'' کی تکذیب سے مراد جیسا کہ ہم نے عرض کیا رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس سے بعد کی آیت میں آسمان کی تخلیق اور اس کی تزیین وآرائش پر غور وفکر کی دعوت ہے۔ اس میں قیامت کے علاوہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کی طرف بھی اشارہ مراد ہو سکتا ہے، چنانچہ آسمان کا یہ سارا نظام جس طرح سورج سے وابستہ ہے اس کے طلوع ہونے سے سارے ستارے بے نور ہو جاتے ہیں۔ پیدا کرنے والے نے اگر یہ فوقیت سورج کو دے رکھی ہے تو وہ انسانوں میں رسول اللہ ﷺ کو عظمت اور فوقیت کیوں نہیں دے سکتا؟ آسمان کا سورج تو ''سراج وھاج'' ہے تاہم وہ بے نور ہو جاتا ہے مگر زمین کا ''سراج منیر'' صدا روشن رہے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اسی معنی میں فرماتی ہیں:

لَنَا شَمْسٌ وَلِلْآفَاقِ شَمْسٌ
وَشَمْسِیْ خَیْرٌ مِّنْ شَمْسِ السَّمَآءِ
فَإِنَّ الشَّمْسَ تَطْلُعُ بَعْدَ فَجْرٍ
وَشَمْسِیْ طَالِعٌ بَعْدَ الْعِشَآءِ

''ایک سورج ہمارا ہے اور ایک سورج آسمان کے افق پر طلوع ہونے

والا ہے (لیکن میرا یہ دعویٰ ہے کہ) میرا سورج آسمان والے سورج سے افضل ہے، کیونکہ یہ سورج تو فجر کے بعد طلوع ہوتا ہے، جبکہ میرا سورج عشاء کے بعد طلوع ہوتا ہے۔''

اور کسی نے یوں بھی فرمایا:

أَفَلَتْ شُمُوْسُ الْأَوَّلِيْنَ وَشَمْسُنَا
أَبَداً عَلٰى أُفُقِ الْبَقَآءِ لَاتَغْرِبُ

''پہلوں کے سورج غروب ہو چکے اور ہمارا سورج افق پر ہمیشہ طلوع رہے گا اور کبھی غروب نہ ہوگا۔''

﴿وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَذِكْرَىٰ لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ ۝﴾ (۷،۸)

''اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں ہم نے پہاڑ جمائے اور اس میں ہر طرح کی خوش منظر نباتات اُگا دیں۔ یہ سب آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں، ہر اس بندے کے لیے جو رجوع کرنے والا ہے۔''

''الارض'' زمین، یہ آسمان کے مدِ مقابل ہے۔ جس طرح بسا اوقات بلندی کو آسمان سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی طرح پستی اور نیچے کو زمین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ آسمان کی طرح زمین کو دیکھو اور اس پر غور کرو، جسے ہم نے پھیلایا ہے، نہ آسمان کو بنانے اور زینت بخشنے والا ہمارے سوا کوئی اور ہے اور نہ ہی زمین کو ہمارے علاوہ کوئی بنانے والا ہے۔ اس زمین کی مختلف نوعیتیں ہیں، کوئی حصہ ریت اور شور ہے، تو کوئی حصہ سخت اور سنگلاخ ہے، کوئی حصہ ہموار ہے، تو کوئی بلند و پست ہے، کسی جگہ کوئی فصل پیدا ہوتی ہے تو کسی جگہ دوسری فصلیں پیدا ہوتی ہیں، یہی صورت اس میں جڑی بوٹیوں اور درختوں کے پیدا ہونے کی ہے۔ جس طرح آسمان کو ستاروں سے سجایا ہے، اسی طرح زمین کو سبزہ زار بنا کر خوبصورت بنایا ہے۔ پھر اسی زمین میں بہت سے خزانے بھر دیے ہیں، اس میں سونا، زمرد، ہیرے اور جواہرات وغیرہ ہیں تو اس میں کوئلہ، گندھک، تیل اور گیس وغیرہ کے ذخائر بھی ہیں۔ زمین سے پیدا ہونے اور برآمد ہونے والی تمام اشیاء ﴿خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (البقرۃ:۲۹) سب انسانوں کے فائدہ اور بہتری کے لیے ہیں، اسی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ﴾ (الذاریات:۲۰) زمین میں یقین والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ جس خالقِ مطلق نے زمین کی یہ بستی بسائی ہے کیا یہ سب بے مقصد اور کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، ہرگز نہیں۔

مطلق کا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا تو یہ عظیم الشان کارخانۂ قدرت بے نتیجہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جس مالک نے تمھارے لیے یہ سب کچھ بنایا اور آباد کیا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے اس کا حساب نہ لے۔ اور شکر گزاروں، اطاعت گزاروں اور وفا شعاروں کو اور متمردوں، باغیوں، ناشکروں کو ایک ہی پلڑے میں رکھ دے اور نیکی اور بدی کو یکساں قرار دے۔ اس زمین پر انسان زندگی گزارتا ہے تو اسی زمین میں دفن ہوتا ہے۔

﴿أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝ أَحْيَآءً وَّأَمْوَاتًا﴾

(المرسلات: ۲۵، ۲۶)

''کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کے لیے سمیٹنے والی نہیں بنایا؟''

اسی زمین سے انسان کو بنایا گیا ہے اسی میں وہ بسیرا کرتا ہے، اسی سے اس کی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد اسی میں دفن ہوتا ہے، جو اس میں دفن نہیں ہوتے، آگ میں جلنے یا پانی میں ڈوب مرنے والے بھی کسی نہ کسی واسطہ سے اسی میں جذب ہو جاتے ہیں۔ انسانوں کے علاوہ کتنی مخلوق ہے، جو اس زمین پر بس رہی اور ان کی ضروریات بھی سب اسی زمین کے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہیں، وہ بھی اسی زمین میں مرتے اور اس میں کھپ جاتے ہیں۔ جس مالک اور قادرِ مطلق نے یہ سارا نظام اسی زمین پر چلا رکھا ہے تو کیا اس میں ملنے اور کھپنے والوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر وہ قادر نہیں؟

اسی زمین میں اللہ تعالیٰ نے پہاڑ بنائے جن کے مختلف رنگ اور مختلف وجود ہیں، کوئی سرسبز و شاداب ہیں تو کوئی خشک۔

﴿وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ﴾ (فاطر: ۲۷)

''اور پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔''

پہاڑوں کی اسی کیفیت پر غور و تدبر کے لیے سورۃ الغاشیۃ میں فرمایا گیا ہے:

﴿أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ

رُفِعَتْ ٥ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ٥ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ ٥﴾ (الغاشیہ:۱۷،۱۸،۱۹،۲۰)

''کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اوپر اٹھایا گیا ہے؟ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کیسے جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے؟''

انھیں آخرت پر یقین نہیں تو یہ سوچیں کہ یہ سب اشیاء اگر بن سکتی ہیں اور بنانے والے نے بنا دی ہیں تو اس کے لیے قیامت قائم کرنے اور مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ زندہ کرنے میں کیا دقت ہو سکتی ہے؟

زمین میں پہاڑوں کی ارفع واعلی چوٹیاں اور ان کے مختلف رنگ ڈھنگ اگر ممکن ہیں تو انسانوں میں ارفع واعلیٰ انبیائے کرام علیہم السلام کا بنایا جانا کیوں ناممکن ہے؟ پتھر اگر اپنے انواع واقسام میں مختلف ہو سکتے ہیں تو انسان میں یہ تقسیم بعید کیوں ہے؟ یوں یہ آیت جہاں قیامت کے وجود کی دلیل ہے اس میں انبیائے کرام علیہم السلام کی سچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

زمین میں پہاڑ ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس میں ہر قسم کی خوشنما نباتات بھی پیدا کی ہیں ﴿بَهِيجٍ﴾ ﴿بَهْجَ﴾ سے مشتق ہے، یعنی خوش نما، سورۃ النمل میں ہے: ﴿فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ﴾ (النمل:٦٠) ''کہ پانی سے ہم نے زمین میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔'' جو خالق ومالک نباتات اور جڑی بوٹیوں کے بیج کو زمین میں دفن ہو جانے کے بعد وقتِ مقرر پر طرح طرح کے شگوفے بنا کر نکالتا اور انھیں دوبارہ زندگی بخشتا ہے وہ انسان کو زمین میں دفن ہونے اور اس کے مٹی میں مل جانے کے بعد دوبارہ پیدا کیوں نہیں کر سکتا؟ زمین میں یہ انقلاب تم ہر سال دیکھتے اور اللہ کی قدرت کا مظاہرہ کرتے ہو، مگر اسی زمین سے انسان کے دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کرتے اور اسے محال جانتے ہو۔ جو مالک وخالق پودوں کو دوبارہ زندگی دینے پر قادر ہے، اس کے لیے انسانوں کو دوبارہ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اس آیت میں گو اجمال ہے مگر سورۃ النبأ میں زمین وآسمان اور اس

کے مابین مختلف اشیاء کے ذکر سے آخرت پر استدلال تفصیلاً ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَاداً ۝ وَالْجِبَالَ أَوْتَاداً ۝ وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجاً ۝ وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتاً ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً ۝ وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً ۝ وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعاً شِدَاداً ۝ وَجَعَلْنَا سِرَاجاً وَهَّاجاً ۝ وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجاً ۝ لِنُخْرِجَ بِهِ حَبّاً وَنَبَاتاً ۝ وَجَنَّاتٍ أَلْفَافاً ۝ إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتاً﴾

(النبأ: ٦ تا ١٧)

''کیا ہم نے زمین کو فرش نہیں بنایا؟ اور ہم نے پہاڑوں کو میخوں کی طرح نہیں گاڑا؟ اور ہم نے تمھیں (مردوں اور عورتوں کی شکل میں) جوڑے جوڑے بنایا، اور ہم نے تمھاری نیند کو باعثِ سکون بنایا، اور ہم نے رات کو پردہ پوش بنایا، اور ہم نے دن کو معاش کا وقت بنایا، اور ہم نے تمھارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے، اور ہم نے روشن چراغ (سورج) بنایا، اور ہم نے بادلوں سے بارش برسائی، تاکہ ہم اس کے ذریعے سے غلہ، سبزی اور گھنے باغات اُگائیں، بے شک فیصلے کا دن مقرر ہے۔''

گویا سمجھایا یہ گیا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے مابین کائنات کا یہ نظام ایک قادرِ مطلق کی قدرت کے بغیر جاری ساری نہیں رہ سکتا، جو قادر اس تمام نظام کو چلانے پر قادر ہے وہ اسے فنا کر کے دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے، اس کے لیے اس کے ہاں ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آئے گا تو اس کے حکم سے سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ زمین و آسمان اور اس کے مابین کی مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید کے لیے بھی بطورِ دلیل ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو: (الرعد: ۳، لقمان: ۱۰، ۱۱)

جس طرح پہلی آیت میں آسمان کی تخلیق میں تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے: بناء، تزیین، عدم الفروج۔ اسی طرح دوسری آیت میں زمین کے حوالے سے بھی تین ہی چیزوں کا ذکر ہے: المد، القاء الرواسی، نباتات اور یہ تینوں باہمی ایک دوسرے کے مقابل میں ذکر

ہوئی ہیں۔ ''مد'' میں نیچے کی صورت ہوتی ہے جبکہ ''بناء'' میں بلندی کی، زمین میں پہاڑ ہیں تو آسمان میں سورج اور چاند مرکوز ہیں۔ زمین میں نباتات ہیں جو زمین کے پھٹنے سے نکلتے ہیں۔ جبکہ آسمان میں ستارے بنائے۔ زمین وآسمان کا یہ نظام، اور قدرتِ الٰہی کے یہ مظاہر توجہ کرنے والوں کے لیے عبرت، معرفت وبصیرت اور نصیحت و یاددہانی کا باعث ہیں۔

''تبصِرۃ'' بَصَرَ سے ہے۔ ''بَصَر'' کی جمع ''ابصار'' ہے۔ قوت بینائی کو ''بصر'' کہتے ہیں اور کسی چیز کو دیکھ کر اس سے عبرت اور سبق حاصل کرنے کو بصیرت اور دل کی بینائی کہتے ہیں۔ اور اسی معنی کے لیے ''تبصرۃ'' اور ''بصیرۃ'' کا لفظ ہے اور اس کی جمع بصائر ہے۔ محض آنکھ سے دیکھنے کے لیے ''بصیرہ'' کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ اور ''الذکریٰ'' کے معنی دراصل کثرت سے ذکرِ الٰہی کرنا ہے اور اس میں ''الذکر'' سے زیادہ مبالغہ ہے۔ (المفردات) مراد یہ ہے کہ غفلت چھوڑ کر اللہ کو یاد کیا جائے، یہ سارا کارخانۂ قدرت جہاں بصیرت کا باعث ہے، وہاں اللہ کی یاددہانی اور نصیحت کا سبب بھی ہے، مگر یہ بصیرت ونصیحت توجہ اور رجوع کرنے والوں کے لیے ہے۔

''منیب'' ''نوب'' سے ہے۔ جس کے معنی ہیں کسی چیز کا بار بار لوٹ آنا۔ اسی سے ہے۔ الإنابة إلی اللہ یعنی توبہ اور اخلاصِ عمل کے ساتھ اللہ کی طرف لوٹنا۔ گویا قرآن مجید سے وہی فیض یاب ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے اور اس کی رضا کے جویندہ ہیں، اور ہدایت بھی انھی کا مقدر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ﴾

(الرعد: ۲۷)

''اے نبی! کہہ دیں اللہ جنھیں چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور ہدایت عطا فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔''

یہ نعمت راہِ حق کی جستجو کرنے والوں کے لیے ہے، بے پرواہوں اور ناقدروں کے لیے نہیں۔ زمین وآسمان کی نشانیوں سے مستفید ہونے والے منیبین کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَىٰ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِن نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيبٍ﴾ (سبا:۹)

''کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا جو ان کے آگے اور پیچھے آسمان اور زمین ہے۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو زمین میں دھنسا دیں یا آسمان کا ایک ٹکڑا ان پر گرا دیں، بے شک اس میں نشانی ہے ہر رجوع کرنے والے کے لیے۔''

یہ محض اس کی عنایت ہے کہ تم بچے ہوئے ہو، ورنہ وہ ایک لحظہ میں تمھیں ہلاک کر سکتا ہے۔ یہ زمین و آسمان اور اس کا سارا نظام اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، تم بھاگ کر کہیں جا نہیں سکتے، جب وہ چاہے تمھارے قدموں کے نیچے زمین میں کوئی زلزلہ لا کر اسی زمین کو تمھارا مرقد بنا دے، اور جب چاہے اسی آسمان سے کوئی بجلی یا ناگہانی آفت گرا کر تمھیں تہس نہس کر دے۔ پھر جس قادرِ مطلق کے یہ زمین و آسمان ہیں اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ مرنے کے بعد انسان کے اجزا جہاں جہاں بکھرے پڑے ہیں انھیں زمین سے نکال لے۔ جو زمین اس کے حکم سے تمھارے لیے لقمۂ اجل بن سکتی ہے، وہی اس کے حکم سے تمھیں اُگل بھی سکتی ہے۔ بلکہ یوں ہو بھی چکا ہے جو اہلِ ایمان کے لیے مزید یقین کا باعث ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ ایک آدمی نے اپنے آپ پر بہت ظلم و زیادتی کی، فوت ہوتے ہوئے اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: کہ جب میں فوت ہو جاؤں، تو مجھے آگ میں جلا دینا اور میری نصف راکھ ہوا میں اڑا دینا اور نصف دریا میں بہا دینا۔ اللہ کی قسم! اگر اللہ نے مجھے اٹھا لیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا کہ کسی اور کو اس قدر عذاب میں مبتلا نہیں کرے گا، چنانچہ وہ شخص مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اسی طرح کیا جس طرح ان کے باپ نے کہا تھا، اللہ تعالیٰ نے دریا کو حکم دیا جو تمھارے اندر راکھ ہے اسے جمع کرو، اور ہوا و فضا کو حکم دیا جو ذرات تمھارے اندر ہیں انھیں جمع کر دو۔ یوں اس کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا، اور اس سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا؟ تو اس نے عرض کیا: مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ ''اے میرے رب! آپ سے ڈرتے ہوئے۔'' تو اللہ

تعالیٰ نے اس کے اسی خوف وڈر کی بنا پر اسے معاف کر دیا۔ (بخاری: رقم ۷۵۰۶، مسلم: رقم ۶۹۸۰) اسی طرح اللہ تعالیٰ تبارک وتعالیٰ نے سورۃ البقرۃ میں اپنے ایک بندے کا تذکرہ فرمایا ہے جو تباہ حال بستی کے قریب سے گزرا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے عرض کی کہ بارِ الٰہا! اس بستی کو اس کی ویرانی اور بربادی کے بعد آپ کیونکر زندہ کریں گے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کی وہیں روح قبض کر لی اور سو سال تک اسے موت کی آغوش میں رکھا، پھر اسے زندہ کیا اور اس سے پوچھا بتلاؤ کتنی دیر یہاں ٹھہرے رہے ہو، تو اس نے جواباً عرض کیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نہیں تم تو سو سال تک یہاں پڑے رہے ہو، تم اپنے کھانے اور پینے کی چیزوں کو دیکھو جو زادِ راہ کے طور پر تم نے اپنے ہمراہ رکھی تھیں وہ بھی بدبودار نہیں ہوئیں۔ جب کہ تمھاری سواری گدھے کی ہڈیاں گوشت سے ننگی ہو کر متفرق اور بوسیدہ ہو گئی ہیں، ان ہڈیوں کو دیکھو ہم انھیں کس طرح حرکت دیتے ہیں اور انھیں مناسب طور پر جوڑتے ہیں، پھر ان ہڈیوں کو گوشت پوست کی پوشاک پہناتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تمھیں لوگوں کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کی ایک نشانی بنا دیں۔ جب یہ سب کچھ ہوتا ہوا اس اللہ کے بندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پکار اٹھا کہ ﴿إِنَّ اللَّـهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (البقرۃ: ۲۵۹) ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔'' اس آیت کے بعد اسی نوعیت کا ایک اور واقعہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی ذکر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ مردوں کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل اور محال نہیں وہ ہر کام پر قادر ہے۔

مظاہرِ قدرت سے نصیحت حاصل کرنیوالوں کے بارے میں ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن يُنِيبُ ﴾ (المؤمن: ۱۳)

''وہی ہے جو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے اور آسمان سے تمھارے لیے رزق نازل کرتا ہے، مگر ان سے سبق صرف وہی لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔''

جو اللہ سے پھرا ہوا ہے وہ بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی کوئی نصیحت حاصل

نہیں کرتا، وہ یہ تو دیکھتا ہے کہ یکا یک ٹھنڈی ہوا آئی، بادل گرجا، بجلی چمکی، بارش برسی اور ہماری روزی کا سامان بن گیا، مگر یہ نہیں سوچتا کہ یہ سب کچھ کون کر رہا ہے، اور ایسے منعم کے میرے اوپر کچھ حقوق بھی ہیں کہ نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس وصف کی بنا پر تعریف کی ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ﴾ (ھود: ۷۵)

"بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔"

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مومن کی اس صفت کے بارے میں مدارج السالکین (ص ۴۶۶۔۴۷۴ ج ۱) میں بڑی نفیس بحث کی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ یہ مرتبہ توبہ کے بعد ہے اور چار اوصاف اس کو متضمن ہیں اللہ کی محبت، اللہ کے لیے خضوع، اللہ کی طرف اقبال و توجہ، اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے اعراض۔ جس میں یہ چار صفتیں نہیں وہ "منیب" کی صفت سے متصف نہیں ہو سکتا۔ شائقین اس حوالے سے المدارج کی مراجعت فرمائیں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ تقویٰ کی اگرچہ سب سے اعلیٰ اور ارفع کیفیت یہ ہے کہ انسان غفلت شعار نہ ہو بلکہ ہر لحہ اللہ کا ذاکر و شاکر رہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

أَنْ يُّطَاعَ فَلَا يُعْصٰى، وَيُذْكَرَ فَلَا يُنْسٰى وَأَنْ يُّشْكَرَ فَلَا يُكْفَرُ.

(الحاکم)

"کہ اللہ کی ایسی اطاعت کہ پھر نافرمانی نہ کی جائے اور اللہ کا ایسا ذکر کہ پھر اس کو بھولے نہ، اور اس کا ایسا شکر کہ پھر ناشکری نہ ہو۔"

لیکن انسان خطا، سہو اور نسیان کا پتلا ہے، خطا کے بعد اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ "منیب" ہے۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے لیے کشاں کشاں حاضری بھی "منیب" ہی کا مقدر ہے، جو اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مظہر ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ٥ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ٥ رِزْقًا لِّلْعِبَادِ وَأَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ (۹،۱۰،۱۱)

''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا، پھر اس سے باغات اور اناج کے کھیت اور بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کیے، جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے تہ بہ تہ لگتے ہیں، بندوں کے رزق کے لیے، اس پانی سے ہم مردہ بستی کو زندگی بخشتے ہیں اسی طرح لوگ بھی قبروں سے نکل اٹھیں گے۔''

ان سے پہلی دو آیاتِ مبارکہ میں حیات بعد الممات پر زمین اور آسمان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے حوالے سے استدلال تھا، اب ان دونوں آیات میں زمین وآسمان کے مابین اشیاء کی تخلیق وتنزیل سے استدلال ہے کہ ہم نے آسمان سے ماے مبارک نازل کیا، ہمارے علاوہ اسے کوئی بھی نازل کرنے والا نہیں۔

﴿أَفَرَأَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ٥ ءَأَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ٥ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ﴾

(الواقعة: ۶۸، ۶۹، ۷۰)

''کیا تم نے کبھی دیکھا یہ پانی جو تم پیتے ہو، اسے تم نے بادل سے برسایا ہے یا اس کے برسانے والے ہم ہیں؟ ہم اگر چاہیں تو اسے سخت کھاری بنا دیں، تم کیوں شکر گزار نہیں ہوتے؟''

یہ ماے مبارک ہے، جس سے زمین میں زرخیزی آتی ہے، ایسا نہیں جس سے سیلاب اور تباہی آتی ہے اور قوموں کے لیے عذاب کا باعث بن جاتا ہے، اس کے بابرکت ہونے کی بنا پر رسول اللہ ﷺ اسے اپنے جسدِ اطہر پہ ملتے تھے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں:

أَصَابَنَا وَنَحْنُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَطَرٌ، قَالَ: فَحَسَرَ ثَوْبَهُ حَتّٰى أَصَابَهُ مِنَ الْمَطَرِ، فَقُلْنَا لِمَ صَنَعْتَ هٰذَا؟ قَالَ: لِأَنَّهُ حَدِيْثُ عَهْدٍ بِرَبِّهِ. (مسلم: رقم ۸۹۸)

''ایک بار ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ ہم پر بارش برسنے لگی، تو آپ نے اپنا کپڑا بدنِ اطہر سے ہٹا دیا یہاں تک کہ آپ کے جسدِ اطہر پر بارش کا چھڑکاؤ ہونے لگا، ہم نے عرض کیا آپ نے ایسا کیوں کیا؟ فرمایا: اس لیے کہ یہ ابھی اپنے پروردگار کی طرف سے نئی نئی آئی ہے۔''

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب آسمان پر بادل نمودار ہوتا تو آپ تمام کام ترک کر دیتے اور یہ دعا کرتے اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا. ''اے اللہ! میں اس کی تباہ کاریوں سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔'' اور جب بارش برسنے لگتی تو آپ فرماتے: اَللّٰهُمَّ صَيِّباً هَنِيْئاً اور ایک روایت میں نافعاً ہے، اے اللہ! اسے نفع دینے والی بارش بنا۔ (ابو داود: ۵۰۹۹ وغیرہ) سورۃ الفرقان (۴۸) میں بارش کے پانی کو ﴿ماءً طهوراً﴾ پاک پانی فرمایا ہے، جو طاہر و مطہر ہے۔

﴿فَأَنْبَتْنَا بِهٖ﴾ پھر اس پانی کی بدولت ہم نے ''جنات'' باغات اور اناج کے کھیت اُگائے۔ ﴿الْحَصِيْدِ﴾ ''الحصد والحصاد'' سے ہے جس کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں، آیت کریمہ میں ہے۔ ﴿وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ ''اور جس دن کھیتی کاٹو تو اللہ کا حق بھی اس میں سے ادا کر دو۔'' ﴿الْحَصِيْدِ﴾ کے معنی تباہی و بربادی بھی آئے ہیں اور یہاں ﴿حَبَّ الْحَصِيْدِ﴾ اناج کے کھیت مراد ہیں، جنھیں کاٹ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اور اسی ''مائے مبارک'' سے ہم نے کھجور کے نہایت اُونچے اور بلند و بالا درخت پیدا کیے۔ ﴿بَاسِقَاتٍ﴾ بسق سے مشتق ہے اور ''الباسق'' کے معنی ہیں: بلندی میں اُونچا چلے جانے والا، جس پر پھلوں کے لدے ہوئے تہ بہ تہ خوشے لگتے ہیں۔ ﴿طَلْعٌ﴾ کے معنی آفتاب طلوع ہونے کے ہیں، اور اسی سے کھجور کے گابھے اور خوشے پر بھی اس کا اطلاق ہوا

ہے کہ وہ بھی کھجور کے درخت سے نکلتا ہے۔ اور ﴿نَضِيْدٌ﴾ کے معنی سامان کو قرینے اور سلیقے سے اُوپر نیچے رکھنے کے ہیں۔ کھجور کا یہ گابھا اور خوشہ بھی تہ بہ تہ موتیوں کی طرح نہایت سلیقے سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔ یہ مختلف قسم کے باغات اور قسم قسم کے اناج اور میوے سب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں، یہ نہ تمھاری تخم ریزی کا ایک مسلسل عمل ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی انھیں پیدا کرنے والا ہے:

﴿أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ○ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ○ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَاماً فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ﴾ (الواقعہ:۶۳،۶۴،۶۵)

''کبھی تم نے خیال کیا کہ یہ بیج جو تم بوتے ہو، ان سے کھیتیاں تم اُگاتے ہو یا ان کو اُگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اِن کھیتیوں کو بھس بنا کر رکھ دیں اور تم طرح طرح کی باتیں کرتے رہ جاؤ۔''

اس لیے یہ سب اسی کے فیضان کا نتیجہ ہے، اور یہ اس لیے کہ ﴿رِزْقاً لِلْعِبَادِ﴾ بندوں کو اس سے رزق ملے، اور زمین میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے، بلکہ پورے آفاق میں جو کچھ بھی بنایا گیا ہے یہ سب انسان کے لیے ہے، ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا﴾ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کا محتاج نہیں وہ سب کو کھلاتا ہے، خود کھانے پینے سے بے نیاز ہے۔'' ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ اور یہ رزق بلا تفریق سب انسانوں کے لیے ہے، البتہ عبدِ ''منیب'' رزق کھا کر ذاکر و شاکر بنتا ہے اور دوسرا حیوانوں کی طرح محض پیٹ بھرنے کے لیے کھاتا ہے۔

اس پانی سے مردہ زمین کو زندگی ملتی ہے۔ بنجر اور مردہ زمین پر بارش برستی ہے تو اسے زندگی مل جاتی ہے ہر سو ہریالی اور شادابی نظر آتی ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار کئی مقامات پر ہوا، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''ان لوگوں کے لیے مردہ زمین ایک نشانی ہے، ہم نے اس کو زندگی بخشی اور اس سے غلہ نکالا جسے یہ کھاتے ہیں، ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ان کے اندر سے چشمے جاری کیے، تا کہ یہ اس کے پھل

کھائیں، یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا پیدا کیا ہوا نہیں، پھر یہ کیوں شکر ادا نہیں کرتے؟" (یٰسٓ: ۳۳، ۳۴، ۳۵)

جس طرح پانی سے ہم مردہ زمین کو زندگی بخشتے ہیں، اسی طرح انسانوں نے بھی زمین سے نکلنا ہے، انسان دو اڑھائی من کا، پانچ چھ فٹ لمبا، زمین میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ عزیز و اقارب بڑے احتیاط و اہتمام سے قبر میں اُسے اُتار دیتے ہیں، مگر چند دنوں کے بعد یہ کیڑے مکوڑوں کی غذا بن جاتا ہے یا خود مٹی ہی اسے چٹ کر جاتی ہے، الا ماشاء اللہ۔ اسی زمین میں ایک ننھا منا رائی اور خشخاش کا بیج ہے یا دیگر جڑی بوٹیوں کا معمولی بیج ہے، مٹی کی تہ میں چھپا ہوتا ہے اور ایک مدت تک اسی طرح محفوظ رہتا ہے، وقتِ موعود پر بارش برستی ہے، یا اسے پانی ملتا ہے تو اس سے نرم و نازک کونپل نکلتی ہے، اور جڑی بوٹی یا پودا اور درخت کی شکل اختیار کر جاتا ہے، مضبوط و قوی ہیکل حضرت انسان کا وجود چند دنوں میں خاک میں ملا دینے والا اور ایک رائی اور خشخاش کو کئی ماہ، بلکہ سال تک مٹی کی تہ میں محفوظ رکھنے والا کون ہے؟ جو ہستی دانۂ رائی اور چھوٹے چھوٹے بیجوں سے جڑی بوٹیاں اور درخت پیدا کر سکتی ہے وہ زمین میں ملے اور بکھرے ہوئے انسان کے اجزا کو از سرِ نو پیدا کرنے پر کیوں قادر نہیں؟ زمین کی حیات سے حیات بعد الموت پر یہ استدلال قرآنِ مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ الَّذِيْ أَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيْرُ سَحَاباً فَسُقْنَاهُ إِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ﴾ (فاطر: ۹)

"اور اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے، پھر وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر ہم اسے ایک مردہ شہر کی طرف لے جاتے ہیں اور اسی سے ہم مردہ زمین کو زندگی دیتے ہیں۔ (مرے ہوئے انسانوں کا قیامت کے دن) اسی طرح جی اٹھنا ہے۔"

احادیث میں اس کی وضاحت ہے کہ جب تمام جاندار قیامت کے دن ختم ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے نیچے سے بارش برسائیں گے۔ جسے ماء الحیاۃ کا نام

دیا گیا ہے۔ بعض ضعیف روایات میں ہے کہ یہ بارش چالیس سال تک برستی رہے گی، تمام زمین پر بارہ ہاتھ تک پانی ہوگا، پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو تمام اجساد جو ریڑھ کی ہڈی کی صورت میں محفوظ تھے، ان سے انسان کا دوبارہ وجود بنے گا اور تمام ارواح اپنے اپنے اجساد میں لوٹ جائیں گی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے النھایہ (۱۸۹،۱۹۳ج ۱) میں اور علامہ القرطبی رحمہ اللہ نے التذکرہ میں ان احادیث وآثار کا تذکرہ کیا ہے۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیثِ شفاعت میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرمائیں گے کہ جو لا الہ الا اللہ کہتا تھا اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تھا، اسے جہنم سے نکال لاؤ، چنانچہ وہ جہنم میں سے انھیں سجدہ کے اثر سے پہچانیں گے، جہنم کی آگ نے انھیں جلا دیا ہوگا، مگر سجدہ کی جگہ یعنی پیشانی بچی ہوئی ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جہنم پر سجدہ کی جگہ کو جلانا حرام کر دیا ہے، جہنم سے وہ نکالے جائیں گے، ان پر ماء الحیاۃ ڈالا جائے گا تو وہ دوبارہ صحیح ہو جائیں گے۔ (مسلم: رقم ۴۵۱) یوں گویا مردہ زمین بھی پانی کی برکت سے آباد وشاداب ہوتی ہے۔ پانی کی بدولت قبروں سے موتیٰ کو زندگی ملے گی اور پانی ہی کی بدولت جہنم کے جلے ہوؤں کو تر وتازگی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ (الانبیاء: ۳۰)

''اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے زندگی بخشی''

اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ﴾ (النور: ۴۵)

''اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔'' ہر دابہ کو نطفہ سے اور ہر شے جس میں حیات ہے اسے پانی کی بدولت زندگی ملی ہے۔ فرشتوں یا جنات کے بارے میں اگر ثابت ہو جائے کہ ان کے مادہ میں پانی کا عنصر نہیں تو وہ اس عام حکم سے مستثنیٰ قرار دیئے جائیں گے۔

﴿كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّأَصْحَابُ الرَّسِّ وَثَمُودُ ۝ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَإِخْوَانُ لُوطٍ ۝ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيدِ﴾ (۱۲،۱۳،۱۴)

''ان سے پہلے جھٹلایا نوح کی قوم اور اصحاب الرس اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائی اور ایکہ والے اور تبع کی قوم، ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو میری وعید ان پر چسپاں ہوگئی۔''

پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کو قیامت کے لیے بطورِ دلیل پیش کیا کہ جو ذات آسمانوں کو بنانے پر قادر ہے، جس نے زمین بنائی اس میں انواع واقسام کے پھل پھول اور کھانے کی اشیاء پیدا کیں، بارش برسا کر مردہ زمین کو حیات بخشی، انسان تو اس پوری مخلوق کے مقابلے میں ذرۂ ناچیز ہے اسے موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنا کیا اللہ کے لیے مشکل ہے؟ جس مالک نے پہلی بار پیدا کیا، پھر اسے موت دی کیا وہ اسے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں؟ جب قادرِ مطلق وہی ہے تو وہ دوبارہ زندگی بخشنے پر قادر کیوں نہیں؟

اب ان آیات میں گزشتہ کچھ قوموں کے انجام سے خبردار کیا گیا ہے، اور یوں قریش کو ڈرایا اور سمجھایا گیا ہے کہ ان سابقہ قوموں کے انجام سے سبق حاصل کرو، جنھیں ہمارے انبیاء علیہم السلام کی تکذیب کے نتیجہ میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا، اگر تمھاری روش یہی رہی تو تم بھی اللہ کے عذاب میں دھر لیے جاؤ گے اور کوئی طاقت تمھیں اللہ کی پکڑ سے بچا نہیں سکے گی۔

قومِ نوح

انھی قوموں میں ایک حضرت نوح علیہ السلام کی قوم تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک اپنی قوم کو دین کی دعوت دی اور اللہ کی نافرمانی سے ڈرایا، مگر ان کی سر

کشتی کا عالم یہ تھا کہ گنتی کے چند افراد ہی ان کے ہمنوا بن سکے، ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (ھود:۴۰) بعض نے ان کی تعداد ۷۰، ۸۰ اور بعض نے صرف دس (۱۰) ذکر کی ہے۔

سورۃ الاعراف، یونس، ھود، الأنبیاء، المؤمنون، الفرقان، الشعراء، العنکبوت، الصٰفٰت، صٓ، المؤمن، الشوریٰ، الذاریات، النجم، القمر، الواقعہ اور سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ ہے۔

اصحاب الرس

ایک قوم ''اصحاب الرس'' تھی۔ ''رس'' کے معنی پرانے کنوئیں کے ہیں، اس لیے اصحاب الرس کے معنی ہوئے کنوئیں والے، بعض نے کہا ہے کہ ''رس'' ایک وادی کا نام ہے، جاہلی شاعر نابغہ نے کہا ہے:

وَهُنَّ يُوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ

''اور وہ وادی رس کے لیے ایسے تھے جیسے ہاتھ منہ کی طرف'' (المفردات) یہ وادی کہاں ہے؟ اور کونسی ہے؟ یا یہ کنواں کہاں ہے؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اور امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۃ الفرقان کی آیت ۳۸ کے تحت اور حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے البدایہ میں بھی اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم نے قصص القرآن میں بھی بڑی تفصیل سے اس پر بحث کی اور مختلف آرا پر بڑا مناسب تبصرہ بھی کیا، اور اپنا رجحان یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ کسی قدیم العہد قوم کا تذکرہ ہے اور یہی بات زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ اس قوم کا تذکرہ سورۃ الفرقان میں بھی حضرت نوح علیہ السلام کے بعد قومِ عاد وثمود کے ساتھ ہوا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا ایک یہ قول ہے کہ یہ اذربیجان میں ایک کنواں تھا۔ اور عکرمہ رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ اس قوم نے اللہ کے نبی کو کنوئیں میں ڈال کر مار دیا تھا۔

محض تاریخ اور اس کی تعینات ومباحث قرآنِ مجید کا موضوع نہیں، بلکہ قرآن کا مقصد موعظت وعبرت ہے اور اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا ذکر کیا ہے۔

قومِ ثمود

جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ السلام کو نبی بنا کر مبعوث کیا، یہ قوم ''حجر'' مقام میں رہتی تھی، جو مدینۂ طیبہ اور تبوک کے مابین حجاز کے مشہور مقام العلاء میں واقع ہے، جسے عہد نبوی میں ''وادی القریٰ'' کہا جاتا تھا۔ آج بھی وہاں کے باشندے اس جگہ کو ''الحجر، مدائنِ صالح اور فج الناقہ'' کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور پہاڑوں کو تراش خراش کر بنائے گئے ان کے گھروں کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے تفہیم القرآن کی تیسری جلد میں اس کی تصاویر بھی دی ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام کی نافرمانی میں اس قوم کی تباہی کا تذکرہ سورۃ الأعراف، ھود، الحجر، الشعراء، النمل، حم السجدۃ، الذاریات، النجم، القمر، الحاقۃ، الفجر اور الشمس میں بیان ہوا ہے، اور اس قوم پر اس قدر شدید اور ہولناک زلزلہ آیا اور خوفناک آواز اور دھماکا ہوا کہ انھیں تباہ کر کے رکھ دیا۔ قوم ثمود کا زمانہ ۱۸۰۰ قبل مسیح علیہ السلام شمار کیا گیا ہے۔

قومِ عاد

جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا تھا، اس قوم کا مرکزی مقام ''احقاف'' تھا۔ سورۃ الأحقاف کا نام اسی مقام کی نسبت سے ہے۔ احقاف، حقف کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی مانند ہوں۔ یہ حضر موت کے شمال میں واقع صحرائے عرب، جو الربع الخالی کے نام سے مشہور ہے، کے جنوب مغربی حصے کا نام ہے، جہاں اب آبادی کے کوئی آثار نہیں اور نہ ہی وہاں کوئی فرد جانے پر آمادہ ہوتا ہے، یہ قوم بڑی تنومند اور طاقت ور تھی، خود کہتے تھے ﴿مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً﴾ (حم السجدۃ: ۱۵) ''ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے۔'' اللہ تعالیٰ نے انھی کے بارے میں فرمایا کہ ﴿الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ﴾ (الفجر: ۸) ان کی مانند کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔ حضرت ہود علیہ السلام کی نافرمانی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سات راتیں اور آٹھ دن لگاتار سناٹے کی ایسی ہوا چلی کہ انھیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا، وہ زمین پر یوں مردہ گرے پڑے

تھے جیسے کھجور کے تنے گرے پڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا ذکر مختلف مقامات پر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: سورۃ الأعراف، ھود، الفرقان، الشعراء، العنکبوت، حم السجدۃ، الأحقاف، الذاریات، النجم، القمر، الحاقۃ، الفجر۔ قوم عاد کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م شمار کیا گیا ہے۔ اور بعض ۳۰۰۰ ق م ذکر کرتے ہیں۔

فرعون

یہاں قومِ عاد و ثمود، اصحاب الرس اور قومِ نوح کی طرح فرعون کی قوم کا نہیں، بلکہ فرعون کا ذکر ہے کیونکہ اصل مجرم اور سرغنے کی حیثیت فرعون ہی کی تھی، اسی کے بارے میں ذکر ہے: ﴿وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدٰى﴾ (طٰہٰ: ۷۹) ''فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، اس نے کوئی صحیح راہنمائی نہیں کی تھی۔'' اس کی سرکشی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ وہ کہتا تھا: ﴿أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلٰى﴾ (النازعات: ۲۴) ''میں تمھارا سب سے بڑا پروردگار ہوں۔'' مجھ سے بڑا کون ہے؟ جس کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اس کا رسول ہوں، وہ غرور و تکبر میں کہتا تھا:

﴿يَا قَوْمِ أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الزخرف: ۵۱)

''اے میری قوم! کیا مصر کا بادشاہ میں نہیں، اور یہ نہریں میرے زیرِ اثر نہیں چل رہیں، کیا تمھیں یہ نظر نہیں آتا؟''

اس لیے اصل مجرم وہی تھا، بلکہ اس کا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا:

﴿اذْهَبْ إِلٰى فِرْعَوْنَ إِنَّهُ طَغٰى﴾ (طه: ۲۴، النازعات: ۱۷)

''فرعون کے پاس جاؤ بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام نے اسے ڈرایا، سمجھایا مگر وہ کبر و عناد میں اندھا ہو گیا، بالآخر وہ انھی نہروں میں سے ایک نہر میں مع اپنے حواریوں کے غرق کر دیا گیا، جن کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ یہ میرے حکم سے چلتی ہیں۔ فرعون کا ذکر قرآنِ مجید میں حسبِ ذیل ستائیس

(۲۷) سورتوں میں آیا ہے: سورۃ البقرۃ، آلِ عمران، الأعراف، الأنفال، یونس، ھود، ابراہیم، الاسراء، طٰہٰ، المؤمنون، الشعراء، النمل، القصص، العنکبوت، صٓ، غافر، الزخرف، الدخان، قٓ، الذاریات، القمر، التحریم، الحاقۃ، المزمل، النازعات، البروج، الفجر۔

اِخوان لوط

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادرزادہ تھے، اوران کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیرِ سایہ گزرا، اوراُنھی کی تربیت میں وہ پروان چڑھے، اُنھی کے مشورہ سے وہ شرقِ اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے گئے۔ اور وہاں کے بسنے والوں کو دعوت توحید دی اور اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت سے سرفراز فرمایا، وہ قوم فواحش اور منکرات میں مبتلا تھی، اور دیگر قباحتوں کے علاوہ ایک انتہائی خبیث عمل کے وہ موجد تھے، وہ اپنی نفسانی خواہشات اپنی بیویوں کی بجائے خوب رولڑکوں سے پوری کرتے، دنیا میں اس خبیث عمل کا آغاز انھی مردودوں نے کیا، ان کی خباثت اور بے حیائی اس حد تک تجاوز کر گئی تھی کہ وہ اس بدکاری کو عیب نہیں سمجھتے تھے، اسے وہ علی الاعلان کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے انھیں اس بدعملی سے روکنے کی بہر نوع کوشش کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب میں دھر لیے گئے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُودٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِينَ بِبَعِيدٍ﴾ (ھود:۸۲،۸۳)

''پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا اوراس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے، جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا۔ اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں۔''

جس طرح ان ظالموں نے فطرت کو اُلٹا کر دیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کا تختہ ہی ان پر اُلٹ دیا اوران کی خباثت وشناعت کے نتیجہ میں مزید ان پر پتھروں کی بارش برسائی، جن میں سے ہر پتھر نشان زدہ تھا کہ اس نے کہاں اورکس پر پڑنا ہے۔ أعاذنا اللہ منہ

حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کا ذکر سورۂ ھود، الحجر، الانبیاء، الشعراء، النمل، العنکبوت، الصّٰفّٰت، النجم اور القمر میں بھی آیا ہے۔

اصحاب الأیکہ

ایکہ والے ''ایکہ'' کے معنی گھنے جنگل اور درختوں کے جھنڈ کے ہیں۔ حضرت شعیب علیہ السلام انھی کی طرف نبی بنا کر مبعوث کیے گئے تھے۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء آیت (۱۷۶، ۱۷۸) میں ہے اور مدین کی طرف بھی ان کے نبی ہونے کا ذکر ہے، جیسا کہ سورۃ الأعراف (۸۵) ھود (۹۴) اور العنکبوت (۳۶) میں ہے۔ مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں یا یہ دو الگ الگ قومیں ہیں، یہ دونوں اقوال دراصل درست ہیں کیونکہ یہ ایک ہی نسل کی دو شاخیں اور دو قبیلے تھے۔ یہ لوگ بحرِ قلزم کے مشرقی کنارے اور عرب کے شمال مغرب میں ایسی جگہ آباد تھے، جو شام سے متصل حجاز کا آخری حصہ ہے اور اہلِ حجاز، شام و فلسطین جاتے ہوئے وہاں سے گزرتے تھے، اور ان دونوں کی طرف حضرت شعیب علیہ السلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے، یہ قومیں تجارت پیشہ تھیں اور دوسری اعتقادی کمزوریوں کے ساتھ ماپ تول میں کمی کرتی تھیں، اللہ تعالیٰ کے نبی نے انھیں سمجھایا، مگر وہ اپنے بدعقیدہ و عمل سے باز نہ آئے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کی لپیٹ میں آئے۔ ان کا ذکر سورۃ الأعراف، التوبہ، ھود، الحجر، طٰہٰ، الحج، الشعراء، القصص، العنکبوت، اور صٓ میں بھی آیا ہے۔

قومِ تبع

تُبّع یمن کے قبیلہ حِمیر کے بادشاہ کا لقب ہے۔ جیسے کسریٰ ایران کے، قیصر روم کے اور فرعون مصر کے بادشاہ کا لقب رہا ہے۔ حمیر قبیلے نے اڑھائی سو برس تک حکومت کی۔ عرب شعراء ان کی عظمت اور شان و شوکت کا بہت چرچا کرتے ہیں۔ اس قوم کا ذکر سورۃ الدخان میں بھی ہوا ہے:

﴿أَهُمْ خَيْرٌ أَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ أَهْلَكْنَاهُمْ إِنَّهُمْ

كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ﴾ (الدخان: ۳۷)

''کیا یہ (قریش) بہتر حالت میں ہیں یا قومِ تبع، اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے، ہم نے انھیں ہلاک کر دیا، بے شک وہ نافرمان تھے۔''

ان کی شان و شوکت خاک میں مل گئی، عرب مؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ حمیری ملوک وہ ہیں جو صرف یمن کے حکمران تھے اور جن کی حکمرانی یمن اور حضرموت دونوں پر تھی، انھیں تبع یا تبابعہ کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ''تبع'' بادشاہ کا نام ''الحارث الرائش'' تھا۔ اور تُبَّع کی وجۂ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک بادشاہ یمن کا ہوتا تھا اور ایک حضرموت کا، تمام یمنی ایک بادشاہ پر متفق نہ تھے، جب حارث الرائش بادشاہ بنا تو دونوں اس پر متفق ہو گئے اس کی تبعیت کی بنا پر اس کا لقب ''تبع'' ہو گیا۔ ''تبع'' عربی لفظ ہے تو اس کے معنی ''متبوع'' کے ہیں، جس کی پیروی اور اطاعت کی گئی ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی قادر، جبار اور صاحبِ قوت کے ہیں۔ عام مؤرخین کا خیال ہے کہ تین تبع ہو گزرے ہیں، تبع اکبر کا نام الحارث الرائش تھا۔ تبعِ اوسط کا نام اسعد ابوکرب تھا اور تبع اصغر کا نام حسان تھا۔ تاریخِ ارضِ قرآن میں اس کا نام تبع بن حسان ہے جو محلِ نظر ہے۔ اسعد ابوکرب جس کا دور ۴۰۰ء سے ۴۲۵ء بتایا گیا ہے، یثرب یعنی مدینۂ طیبہ آیا، مگر علامہ السہیلی رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی آمد قبلِ اسلام سات سو سال ذکر کی ہے، وہ یہاں یثرب کو تاراج اور یہودیوں کو قتل کرنا چاہتا تھا، مگر اسے ایک یہودی عالم نے اس اقدام سے منع کیا اور کہا کہ یہ شہر ایک نبی کی ہجرت گاہ ہے، جو دینِ ابراہیمی کو زندہ کرے گا، تو وہ اپنے ارادہ سے باز آ گیا۔ کہتے ہیں کہ اس تبع نے سب سے پہلے بیت اللہ پر غلاف چڑھایا، بلکہ اس کا ذکر ایک حدیث میں بھی بیان ہوا ہے۔ یہ اسعد تبع دینِ ابراہیمی کے مطابق مسلمان تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے برا کہنے کی ممانعت فرمائی ہے، چنانچہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: كَانَ تُبَّعٌ رَجُلًا صَالِحًا تبع نیک اور صالح انسان تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی نہیں، بلکہ اس کی قوم کی مذمت کی ہے۔ (الحاکم وغیرہ الصحیحۃ: رقم ۲۴۲۳) امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ زمانہ

اسلام میں صنعاء، یمن میں ایک قبر کھودی گئی تو اس میں دو لڑکیوں کی لاشیں ملیں ان کی لوح پر لکھا تھا کہ یہ تبع کی بیٹیاں ہیں یہ وفات کے وقت لَـا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـه کی شہادت دیتی تھیں۔ (ابن کثیر) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے۔ (تاریخ ارض القرآن، سید سلیمان ندوی۔ الروض الانف مع ابن ہشام: ص۲۳، ۲۷ ج۱، فتح الباری: ص ۴۵۶ ج ۳، ۲۵۲ ج ۷، تاريخ مكة للأزرقي، القرى لقاصد أم القرى للطبري، التعريف والإعلام فيما أبهم من الأسماء والأعلام في القرآن الكريم للسهيلي)

﴿كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ﴾ ان تمام کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے رسول کو جھٹلایا۔ ایک اور مقام پر اسی طرح سابقہ امتوں کی تباہی کا سبب یہی بیان ہوا کہ ﴿إِنْ كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ﴾ (صٓ:۱۴) ''ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا تو میرا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔'' ان قوموں کی طرف رسول تو ایک ہی تھا، مگر ایک رسول کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب کے مترادف ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الشعراء:۱۰۵) ﴿كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الشعراء:۱۲۳) ﴿كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الشعراء:۱۴۱) ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الشعراء:۱۶۰) ﴿كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الشعراء:۱۷۶) ﴿كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ﴾ (الحجر:۸۰) اسی پیرایۂ بیان میں آیا ہے۔ ایمان کے لیے تمام انبیاء و رسل پر ایمان لازم ہے کسی ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے، جیسے یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفر کیا اور یہود و نصاریٰ دونوں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا انکار کر کے کافر ٹھہرے۔ ایمان یہ ہے کہ:

﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلَآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ﴾

(البقرۃ:۲۸۵)

''رسول، یعنی محمد ﷺ ایمان لائے جو کچھ ان کے رب کی طرف سے ان پر اُتارا گیا اور (ان کے ساتھ) مؤمن بھی ایمان لائے، ہر ایک ایمان لایا

اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، ہم اس کے کسی رسول کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

کہ بعض کو تسلیم کریں اور بعض کا انکار کریں، اس لیے ایک رسول کا انکار درحقیقت تمام رسولوں کا انکار ہے اسی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ ان قوموں نے سب رسولوں کو جھٹلایا۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رسول کی تفخیم وتکریم کی بنا پر جمع کا لفظ استعمال ہوا ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لوگ بالکلیہ منکرینِ رسالت تھے، تو گویا رسالت کا انکار تمام رسولوں کا انکار ہے۔

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ان اقوام کی تباہی و بربادی کا سبب ''رسول'' کی تکذیب ہے، کسی قوم کی طرف رسول کو بشیر ونذیر بنا کر بھیجا جاتا ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں پر حجت ہوتا ہے، اور اس اتمامِ حجت کے بعد قوم کی نافرمانی کے نتیجے میں اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جابجا اپنے نبی کی مخالفت پر عذاب سے خبردار کیا ہے، مگر یہاں اس کا بیان تطویل کا باعث بنے گا۔

﴿أَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴾(۱۵)

''کیا پہلی بار پیدا کر کے ہم تھک گئے ہیں؟ (نہیں) بلکہ یہ لوگ از سرنو پیدا کیے جانے کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں۔''

پہلی آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی طرف توجہ دلائی ہے، جو آسمان، زمین اور ان کے مابین مخلوق سے ہویدا ہے اور ایک ایک چیز اس کے قادر مطلق ہونے اور وحدہٗ لاشریک ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهُ آيَةٌ
تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ وَاحِدٌ

سورۃ الاحقاف میں فرمایا:

﴿أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقَادِرٍ عَلٰى أَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى بَلٰى إِنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ (الاحقاف:۳۳)

''اور کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک وہ اللہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ ان کے پیدا کرنے سے نہیں تھکا، وہ اس بات پر قادر ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے؟ کیوں نہیں، یقیناً وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کے حوالے سے سوال ہے کہ بھلا بتلاؤ کیا یہ سب کچھ پیدا کرنے سے ہم تھک گئے اور عاجز رہے؟ کیا ان میں کوئی کمی و کجی تمھیں نظر آتی ہے؟ کیا کوئی عقل مند یہ تصور کر سکتا ہے کہ جس مالک نے یہ زمین و آسمان اور ان کے مابین ساری مخلوق بنائی ہے جب وہ پہلی بار ان تمام کو پیدا کرنے سے عاجز نہیں تھا تو وہی مالک اس نظام کی بربادی کے بعد دوسری بار پیدا کرنے سے عاجز کیوں کر ہو سکتا ہے؟ کسی چیز کو پہلی

بار بنانا مشکل ہوتا ہے یا دوسری بار؟ اگر نقشِ ثانی، نقشِ اول سے بہتر ہو سکتا ہے تو دنیا کو دوبارہ پیدا کیوں نہیں کر سکتا؟ اسی حقیقت کا مختلف مقامات پر ذکر ہوا ہے، چنانچہ سورۂ یٰسٓ میں فرمایا کہ یہ کہتے ہیں کہ گلی سڑی ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا:

﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ﴾ (یٰسٓ:۷۹)

''آپ فرما دیجیے: کہ وہی جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا اور وہی ساری مخلوق کو جانتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ (الروم:۲۷)

''وہی ہے جس نے پہلی بار پیدا کیا پھر اسے وہ دوبارہ پیدا کرے گا، دوبارہ بنانا اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

یَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالٰی: یُؤْذِیْنِی ابْنُ آدَمَ یَقُوْلُ لَنْ یُّعِیْدَنِیْ كَمَا بَدَأَنِیْ وَلَیْسَ أَوَّلُ الْخَلْقِ بِأَهْوَنَ عَلَيَّ مِنْ إِعَادَتِهٖ'' (بخاری: رقم ۳۱۹۳)

''اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: آدم کا بیٹا مجھے ایذا دیتا ہے کہتا ہے مجھے جیسا پہلے پیدا کیا ہے ایسا دوبارہ ہرگز نہیں پیدا کیا جائے گا، حالانکہ دوسری بار کی نسبت پہلی بار پیدا کرنا زیادہ آسان نہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے لیے نہ پہلی بار تمام کو پیدا کرنا مشکل تھا نہ ہی دوسری بار۔

﴿بَلْ هُمْ﴾ انھیں ہماری اس قدرتِ کاملہ پر یقین ہے اور اس حقیقت کا بھی اعتراف ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ سب کچھ پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں، اگر شک وشبہ ہے تو دوسری بار پیدا کیے جانے پر ہے، جیسا کہ ایک اور مقام پر ان کی یہ بات بیان ہوئی ہے:

﴿وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا

نَدْرِیْ مَا السَّاعَةُ إِنْ نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴾

(الجاثیۃ:۳۲)

''اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ بالکل برحق ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک نہیں۔تم کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے؟ ہم بس ایک خیال سارکھتے ہیں ہم کو یقین نہیں ہے۔''

جیسے ہر سنی سنائی بات پر کچھ نہ کچھ ظن وگمان ہو جاتا ہے،اسی نوعیت کا قیامت کے بارے میں ان کوگمان یا شبہ تھا، بلکہ بعض نے تو اس کے معنی یہ کیے ہیں:ان نظن الا انکم تظنون ظنا کہ ہمارا خیال ہے کہ قیامت کے بارے میں یہ تمھارا ظن وگمان ہے (قرطبی، فتح القدیر) ورنہ ہم کو اس پر یقین نہیں۔ان کے اسی ذہنی تذبذب کو یہاں لَبْسٌ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔اسی طرح سورۃ الحج (۵) اور النمل (٦٦) میں جو اسی حوالے سے کفار کی طرف سے قیامت کے بارے میں شک اور ریب کا لفظ آیا ہے تو یہ صرف اسی تناظر میں ہے جس کا اظہار وہ اکثر کیا کرتے تھے کہ جب ہم ہڈیاں ہو جائیں گے تو ہمیں دوبارہ کیونکر زندہ کیا جا سکے گا۔یوں نہیں کہ انھیں قیامت کے بارے میں تذبذب وتردد تھا۔تردد کی صورت میں حتمی انکار نہیں ہوتا لیکن وہ تو اس کے انکار کی قسمیں کھاتے اور قیامت کے قائم ہونے کا مذاق اڑاتے تھے۔جیسا کہ باحوالہ پہلے گزر چکا ہے۔سورۃ السجدۃ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَقَالُوْا أَإِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ أَإِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ بَلْ هُمْ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَافِرُوْنَ ۝﴾ (السجدۃ:۱۰)

''اور وہ کہتے ہیں جب ہم مٹی میں رل مل چکے ہوں گے تو وہ پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے درحقیقت یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔''

قیامت کے'' کافرون'' کے بارے میں ہی فرمایا گیا ہے:

﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴾

(المطففین:۱۰،۱۱)

''تباہی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لیے جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں۔''

ان آیات سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے بارے میں یقین کی حد تک انکاری تھے اور تردد وشک محض اسی درجہ میں تھا جو عموماً سنی ہوئی بات کے بارے میں بعض اوقات پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت اکبر الہٰ آبادی نے ایسے لوگوں کے بارے میں ہی فرمایا ہے۔

جو ذکر آتا ہے آخرت کا تو آپ ہوتے ہیں صاف منکر
خدا کی نسبت بھی دیکھتا ہوں یقین رفت وگمان کافی

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾ (۱۶)

''اور بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم جانتے ہیں جو وسوسے اس کے دل میں ہیں اور ہم اس کے زیادہ قریب ہیں اس کی رگِ گردن سے۔''

اس آیتِ مبارکہ میں مزید اللہ ﷻ کی قدرتِ کاملہ کا بیان ہے، اور اس میں قیامت کے بارے میں ایک شبہ کا ازالہ بھی ہے۔ منکرینِ قیامت کو یہ اشتباہ بھی تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ ہر ہر انسان کی زندگی کی جلوتوں اور خلوتوں کو معلوم کیا جا سکے اور ان کا ریکارڈ محفوظ کیا جا سکے اور پھر ایک دن اس کا حساب شروع کر دیا جائے۔ یہ بالکل اسی نوعیت کا اشتباہ تھا جو وہ کہتے تھے کہ جب انسان کے تمام اجزا مٹی میں مل جائیں گے وہ اجزا کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں؟ ان کو ازسرِ نو جمع کرنا اور زندہ کر دینا کیونکر ممکن ہے، جس کا جواب سورت کی ابتدا میں دیا گیا ہے۔ یہاں بتلایا گیا ہے کہ ہمارا علم اس قدر وسیع اور ہماری قدرت اس قدر بے پایاں ہے کہ انسان کا ظاہر و باہر تو کجا اس کا اندر اور باطن بھی ہمارے علم میں ہے، اس کے دل میں جو وساوس پیدا ہوتے ہیں، اس کا دل جو چٹکیاں لیتا اور جو خطرات اس میں اٹھتے ہیں ان سب کو ہم جانتے ہیں، جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ (النمل:۷۴)

''اور بے شک تیرا رب جانتا ہے جو ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے اور جو وہ علانیہ کرتے ہیں۔''

وہ تو اس علم و قدرت کا مالک ہے کہ

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾ (المؤمن:۱۹)

''اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کو اور ان رازوں کو جنھیں سینوں نے چھپا

رکھا ہے۔''

آنکھیں جو چوری چھپے دیکھتی ہیں اور انسان سمجھتا ہے کہ کوئی دیکھ نہیں رہا، مگر اللہ تعالیٰ تو اسے دیکھتا ہے اور آنکھوں کی حرکت کو بھی جانتا ہے۔ آنکھ تو کجا، اللہ تعالیٰ تو دل کے راز بھی جانتا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْأَرْضِ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ﴾ (الانعام:۳)

''اور وہی اللہ ہے آسمانوں اور زمین میں، تمھاری باطنی اور ظاہری باتوں کو جانتا ہے، اور جو کچھ عمل کرتے ہو وہ بھی جانتا ہے۔''

یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ کسی کی کوئی ظاہری و باطنی حرکت اس سے چھپی ہوئی نہیں، اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو بھی ہیں وہ حاکم ہوں یا بزرگ ہوں وہ نہیں جانتے کہ میرے ماننے والے اور معتقدین کے دل میں کیا ہے، وہ بس ظاہری اداؤں سے دیکھتے ہیں کہ میری فرمانبرداری ہو رہی ہے یا نہیں، دلی کیفیات و تأثرات سے وہ بے خبر ہیں۔ کتنے ہیں جو بس مجبوری و مقہوری میں اطاعت گزار بنے ہوئے ہیں، اور زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ مگر ایک اللہ وحدہ لاشریک ہے جو اپنے بندوں کے دلی تأثرات سے بھی واقف ہے اور اس کا قرب سب قربتوں سے زیادہ ہے، چنانچہ فرمایا کہ میں تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہوں۔

﴿الْوَرِيْدِ﴾ کا اطلاق لغوی طور پر شاہ رگ پر بھی ہوتا ہے جو گردن میں ہوتی ہے، اور اس رگ پر بھی جس کا تعلق دل اور جگر سے ہوتا ہے اور وہ خون اور روح کو بدنِ انسانی میں پہنچاتی ہے، مگر طبی اصطلاح میں جو رگیں جگر سے نکلتی اور خون کو جسم میں پہنچاتی ہیں وہ موٹی ہوتی ہیں انھیں ''ورید'' کہتے ہیں، اور جو رگیں دل سے نکلتی ہیں اور خون کی وہ لطیف بھاپ، جسے روح سے تعبیر کیا جاتا ہے، کو انسانی بدن میں پہنچاتی ہیں، انھیں شریانیں کہا جاتا ہے۔ ان وریدوں اور شریانوں کو کاٹ دیا جائے تو انسان کی زندگی کٹ جاتی ہے۔ گویا بتلایا یہ گیا ہے کہ جن موٹی یا باریک رگوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے ہم ان سے بھی زیادہ انسان کے قریب ہیں کوئی چیز بھی ہمارے احاطۂ علم سے خارج نہیں ہے۔ ایک اور

مقام پر فرمایا ہے:

﴿فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ٥ وَأَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ٥ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الواقعہ:۸۳، ۸۴، ۸۵)

''پس کیوں نہیں جب جان حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو، اور ہم اس کے تم سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھتے۔''

ان آیات میں اللہ تعالیٰ کے قرب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں، بلکہ اللہ کا علم اور اللہ کی قدرت مراد ہے اکثر مفسرین کی یہی رائے ہے، مگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''شرح حدیثِ نزول'' وغیرہ میں اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے تفسیر میں فرمایا ہے کہ سورۂ ق اور الواقعہ میں قرب سے مراد اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں۔ یہی رائے ان سے قبل امام ابن جریر رحمہ اللہ کی ہے، لیکن حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مدارج السالکین میں سورۂ ق کی آیت کے حوالے سے فرمایا ہے کہ أَوَّلُ الْآيَةِ يَأْبٰى ذٰلِكَ آیت کا پہلا حصہ اس تاویل کا انکار کرتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کا علم وقدرت مراد ہو یا اللہ تعالیٰ کے فرشتے مراد ہوں یہ قرب ہر خاص وعام، مومن وکافر کے لیے ہے۔ سورۃ المجادلہ میں ہے:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا أَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ٥ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (المجادلہ:۶، ۷)

''اس دن جب اللہ ان سب کو اٹھائے گا، پھر وہ انھیں بتلا دے گا کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں، اللہ نے سب کچھ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ بھول گئے ہیں۔ اور اللہ ہر ایک چیز پر گواہ ہے۔ کیا تمھیں خبر نہیں کہ اللہ کو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا علم ہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ تین آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان کے

درمیان چوتھا اللہ نہ ہو، یا پانچ آدمیوں میں سرگوشی ہو اور ان میں سے چھٹا اللہ نہ ہو، خفیہ بات کرنے والے خواہ اس سے کم ہوں یا زیادہ، جہاں بھی وہ ہوں اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر قیامت کے دن ان کو بتا دے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

''قرب'' کی طرح ان آیات میں ''معیت بھی'' اللہ ذوالجلال والاکرام کے علم اور قادرِ مطلق ہونے کے اعتبار سے ہے۔ سلف رحمہم اللہ ان آیات کا یہی مفہوم لیتے ہیں، یوں نہیں کہ سرگوشی کی محفل میں آدمیوں کے درمیان اللہ سبحانہ وتعالیٰ بھی ایک شخص اور ذات کے لحاظ سے موجود ہوتے ہیں۔ پہلی آیت میں تو اس کا واضح اشارہ بھی ہے کہ انسان اگر اپنی کرتوتیں بھول جاتا ہے تو اپنی اس کمزوری کی بنا پر محاسبہ کا انکار کوئی عقلمندی نہیں، انسان کو اگر یہ یاد نہیں تو پیدا کرنے والے کو تو یہ سب یاد ہے اور وہی سب سے حساب لے گا کوئی چیز اس کی قدرت سے خارج نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ''قرب'' اور ''معیت'' کے مفہوم کی تفصیل شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی شرحِ حدیثِ نزول اور سید بدیع الدین راشدی رحمہ اللہ کی توحیدِ خالص ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ''قرب'' و ''معیت'' تو ہر انسان کے لیے، مگر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ایک ''قرب'' وہ ہے جو اس کے بندوں کے لیے علی حسب المراتب خاص ہے۔ اور اس ''قرب'' کے حصول کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے: چنانچہ ارشاد ہے۔ ﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ (العلق: ۱۹) ''سجدہ کرو اور ہمارے قریب ہو جاؤ۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أَقْرَبُ مَايَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَسَاجِدٌ. (مسلم: رقم ۱۰۸۳ وغیرہ)

''بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب تب ہوتا ہے جب سجدہ کرتا ہے۔''

قیام اللیل بھی اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ (ترمذی: رقم ۳۵۷۹ وغیرہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَاتَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهُ عَلَيْهِ، وَلَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ، الحديث. (بخاری: رقم ۶۵۰۲)

''میرا بندہ جس چیز سے میرا تقرب ڈھونڈتا ہے ان میں سب سے زیادہ میرے نزدیک محبوب وہ عمل ہے جسے میں نے اس پر فرض قرار دیا ہے، اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل پڑھ کر میرا تقرب حاصل کرتا ہے تا آنکہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''

اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: جو اللہ کے ایک بالشت قریب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دو بالشت قریب ہوتے ہیں۔ یہاں ایک ذات کا دوسری ذات سے قربِ ذاتی اور مکانی مراد نہیں جیسا کہ بعض مبتدعین کا خیال ہے، بلکہ یہاں اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے مابین ایک اتصال وتعلق مراد ہے اور یہ ربط وتعلق بندہ کی اطاعت وانابت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے قرب واتصال کا اظہار دعا کی قبولیت، اعانت ونصرت اور توفیق علی الطاعات سے ہوتا ہے، اور اسی قرب کی ضد اللہ سے بُعد، دوری اور انفصال ہے اور مومن کے مقابلے میں یہ ''بُعد'' کافروں اور منافقوں کے حصہ میں آیا ہے۔ مومن کے لیے ''قرب'' حیاتِ جاودانی کا باعث ہے جبکہ کافر کے لیے ''بعد'' عذابِ الٰہی اور جہنم کا سبب ہے۔ أعاذ نا الله منه.

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت تو ''علوّ'' ہے، اور اللہ تعالیٰ مستوی عرش ہیں تو یہ ''قرب'' کیسا؟ اور کیا یہ صفتِ ''علوّ'' کے منافی نہیں؟ بالکل نہیں، ''قرب'' اگر ''علوّ'' کے تقابل میں بھی ہو تب بھی یہ اعتراض درست نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں بے مثال ہیں اور اپنی صفتِ ''علوّ'' کے ساتھ ساتھ ''قریب'' بھی ہیں۔ کسی انسان میں تو یہ دونوں صفتیں باہم متناقض ہیں، مگر اللہ ﷻ اپنی دوسری صفات کی طرح صفتِ قریب میں بھی بے مثال ہے۔ جس طرح صفتِ ''علوّ'' اور صفت استوی علی العرش سے متصف ہونے کے باوصف سمیع وبصیر ہیں اسی طرح وہ اپنی علوِ شان کے ساتھ ساتھ قریب بھی ہیں۔ مگر جب ''قرب'' سے مراد اللہ تعالیٰ کا علم وقدرت ہے تو پھر یہ اشکال ہی ختم ہو جاتا ہے۔

﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (۱۷،۱۸)

''(خیال رکھو) جب دو اخذ کرنے والے اخذ کرتے رہتے ہیں، ایک اس کے دائیں بیٹھا ہے اور دوسرا بائیں بیٹھا ہے وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا، مگر اس کے پاس مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔''

یہ آیات پہلی آیت کا ہی تتمہ ہیں، کہ اللہ تعالیٰ انسان کی تمام حرکات وسکنات کو جانتے ہیں، کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی اس کے علم سے خارج نہیں، اس کے علاوہ اتمامِ حجت کے لیے اللہ تعالیٰ کے دو فرشتے بھی انسان پر نگران مقرر ہیں، انسان جو لفظ بولتا ہے وہ اس کو لکھ لیتے ہیں۔ اس کا بول ہی نہیں، بلکہ ہاتھ پاؤں سے کیے ہوئے تمام اعمال کو بھی وہ نوٹ کرتے ہیں۔ سورۃ الزخرف میں یہی بات یوں ہے:

﴿أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ﴾ (الزخرف:۸۰)

''کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی راز کی باتیں اور ان کی سرگوشیاں سنتے نہیں؟ ہاں! ہم سب کچھ سنتے ہیں اور ہمارے فرشتے ان کے پاس لکھ رہے ہیں۔''

یہاں پہلی آیت نمبر سولہ (۱۶) میں اللہ تعالیٰ کے علم کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں فرشتوں کے نوشتوں کا تذکرہ ہے۔ ﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ تلقّی کے معنی اخذ کرنے، لینے، حاصل کرنے کے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں ہے: ﴿فَتَلَقَّىٰ آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ﴾ آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند کلمات حاصل کر لیے۔ اور ﴿الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ سے دو لینے اور اخذ کرنے والے فرشتے مراد ہیں، جو انسان کے دائیں

بائیں رہتے ہیں۔ دائیں طرف کا فرشتہ انسان کے امورِ خیر کو قلمبند کرتا ہے جبکہ بائیں جانب کا فرشتہ انسان کے امورِ شر کو لکھتا ہے، اور ان فرشتوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ ﴿قَعِيْدٌ﴾ ہیں۔ یہاں قَعِيْدٌ بمعنی قاعد کے ہیں یعنی بیٹھے ہوئے۔ جیسے ''جلیس'' بمعنی ''جالس'' ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ''قاعد'' اور ''جالس'' بیٹھنے والے کو کہتے ہیں، جبکہ جلیس اور قعید، ساتھی اور مصاحب کے مفہوم میں ہے یعنی ہر آن ساتھ رہنے والے ہیں خواہ کوئی بیٹھا ہو، لیٹا ہو یا چلنے پھرنے والا ہو۔ یہ فرشتے بڑے معزز اور باحیا ہیں، جب انسان بول و براز کے وقت یا جماع کی ضرورت کے پیشِ نظر اپنی شرمگاہ سے کپڑا اُٹھاتا ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ (ترمذی: ۲۸۰۰ مجمع الزوائد: ص ۲۹۳ ج ۴، عبدالرزاق: ص ۲۸۵ ج ۱، رقم: ۱۱۰۱) ان فرشتوں کے بارے میں فرمایا کہ وہ ﴿رَقِيْبٌ﴾ یعنی نگران مقرر ہیں اس کی اصل ''رَقَبَةٌ'' ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ نگران بھی اس کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی مقصود ہوتی ہے یا اس لیے کہ وہ نگرانی کے لیے بار بار گردن اٹھا کر دیکھتا ہے ان نگرانوں کو انسان کی طرح کا نگران مت سمجھو، جو اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا، غفلت و سستی اختیار کر جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کے نگران ایسے ہیں جو ﴿عَتِيْدٌ﴾ بھی ہیں، ہر لحظہ موجود، حاضر، مستعد اور بروقت تیار رہتے ہیں، ذرہ بھر اس میں کوتاہی نہیں کرتے، اور جو انھیں حکم دیا جائے نافرمانی نہیں کرتے، ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ﴾ (التحریم: ۶) فرشتوں کی اسی ذمہ داری کا ذکر ایک اور مقام پر یوں ہے:

﴿وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ ○ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ○ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ○﴾ (الانفطار: ۱۰، ۱۱، ۱۲)

''اور بے شک تم پر نگران مقرر ہیں، ایسے معزز کاتب ہیں جو تمھارے ہر فعل کو جانتے ہیں''

یعنی یہ فرشتے بڑے معزز و مکرم ہیں، اللہ تعالیٰ کے سچے اطاعت گزار ہیں، کسی پر کوئی زیادتی نہیں کرتے، نہ انھیں کسی سے ذاتی محبت ہے نہ ہی عداوت، جو کچھ وہ دیکھتے سنتے ہیں، بغیر کسی رو رعایت اور بغیر افراط و تفریط کے بالکل صحیح صحیح سب کچھ لکھ رہے

ہیں، انھی کے یہ نوشتے جب قیامت کے روز مجرم دیکھیں گے تو افسوس سے اعتراف کریں گے کہ:

﴿يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَّلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾

(الکھف: ۴۹)

''ہائے افسوس! یہ کیسی کتاب ہے، جس میں ہماری کوئی چھوٹی اور بڑی حرکت ایسی نہیں جو درج نہ ہو، جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ سب اپنے سامنے پائیں گے اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔''

یہی نامۂ اعمال قیامت کے دن کھلی کتاب کی طرح انسان کے سامنے ہوگا اور اسے کہا جائے گا:

﴿اقْرَأْ كِتَابَكَ ط كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا﴾

(الاسراء: ۱۴)

''پڑھ اپنا نامۂ اعمال، آج تو اپنا حساب لگانے کے لیے خود ہی کافی ہے۔''

اس بارے میں اختلاف ہے کہ کیا فرشتے ہر عمل اور ہر بول لکھتے ہیں یا وہی لکھتے ہیں جس میں خیر وشر کا اور ثواب وعقاب کا پہلو ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید کے ظاہر سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر قول وعمل لکھا جاتا ہے۔ (ابنِ کثیر) یہی قول امام مجاہد، طاوس، عطاء بن ابی رباح رحمہم اللہ کا ہے۔ امام ربیع بن خثیم رحمہ اللہ اس بارے اس قدر محتاط تھے کہ ایک بار ان کی بیٹی نے ان سے کھیلنے کی اجازت طلب کی، تو انھوں نے اجازت نہ دی، شاگردوں نے عرض کیا کہ آپ اجازت دے دیں، تو انھوں نے فرمایا: میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرے نامۂ اعمال میں یہ لکھا جائے کہ اِذْهَبِيْ فَالْعَبِيْ جاؤ کھیلو۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ جاؤ اچھی بات کہو اور اچھا عمل کرو۔ (ابن ابی شیبہ، الثقات للعجلی: ص ۱۵۴) امام احمد رحمہ اللہ بیماری کی حالت میں کراہتے اور ہائے ہائے کرتے تھے، مگر جب انھیں پتہ چلا کہ امام طاوس رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ فرشتے مریض کے کراہنے کی آواز بھی لکھتے ہیں، تو انھوں نے پھر زندگی بھر ہائے

ہارے نہیں کہی۔ (ابن کثیر) امام طاؤس رحمہ اللہ کے علاوہ یہی بات امام مجاہد رحمہ اللہ نے بھی فرمائی ہے۔ (ابن ابی شیبہ) امام عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ہر اس کلام کو مکروہ سمجھتے تھے جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے اس کا تعلق نہ ہو، یا جائز دنیوی فائدہ اس میں نہ ہو۔ (ابن ابی شیبہ)

یہ زمانہ اور زندگی بڑی قیمتی ہے اسے فضول باتوں میں یا لایعنی مشاغل میں ضائع کرنا کوئی عقلمندی نہیں، لایعنی امور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہر حال روکا ہے، اس حکم کی نافرمانی پر اگر باز پرس ہو تو انسان کو اس بارے میں ابھی سے فیصلہ کرنا چاہیے کہ جواب کیا ہو گا، اور یہ بھی کہ یہ لایعنی امور مقصدِ زندگی تو بہر حال نہیں ہیں، قرآنِ مجید کے ظاہری سیاق سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ہر قول و عمل لکھا جاتا ہے۔

انسان کے دل میں جو خطرات آتے ہیں انھیں فرشتے نہیں لکھتے، کیا وہ ان کی دسترس سے باہر ہیں یا ان کے لکھنے کے مکلّف نہیں ہیں؟ قرآنِ مجید کے عام الفاظ ﴿یعلمون ماتفعلون﴾ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیت وارادہ کو بھی لکھتے ہیں، کیونکہ جس طرح اعضاء و جوارح کا عمل ہے اسی طرح نیت دل کا فعل و عمل ہے، اس کی دلیل حسبِ ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے، کہ نیکی کے قصد وارادہ کو بھی لکھا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

إِذَا أَرَادَ عَبْدِيْ أَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً فَلَا تَكْتُبُوْهَا عَلَيْهِ حَتّٰى يَعْمَلَهَا، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا بِمِثْلِهَا وَإِنْ تَرَكَهَا مِنْ أَجْلِيْ فَاكْتُبُوْهَا لَهُ حَسَنَةً، وَإِنْ أَرَادَ أَنْ يَعْمَلَ حَسَنَةً فَلَمْ يَعْمَلْهَا اكْتُبُوْهَا لَهُ حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلٰى سَبْعِمِائَةٍ (مسلم: رقم ۳۳۶)

"میرا بندہ جب کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اسے نہ لکھو تا آنکہ وہ اس پر عمل کرے، اگر اس پر عمل کرے تو اسی کی مثل اسے لکھو، اور اگر میری وجہ سے وہ اس ارادہ پر عمل نہ کرے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو، اور اگر کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرے مگر وہ عمل نہ کر سکے تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو، پھر اگر اس پر

عمل کرے تو اسے دس سے سات سو تک لکھو۔''

یہی روایت صحیح بخاری (۷۵۰۱) و مسلم (رقم ۳۳۸) میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ فرشتے چونکہ نوری مخلوق ہیں اس لیے وہ حسی اور وجودی امور کا ادراک ہی نہیں رکھتے، بلکہ روحانی اور غیر حسی امور سے بھی مطلع ہو جاتے ہیں۔ ابو معشر سے کسی نے پوچھا کہ انسان دل میں اللہ کا ذکر کرتا ہے تو فرشتے اسے کیسے لکھ لیتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: وہ اس کی خوشبو پا لیتے ہیں۔ (ابن المنذر، الدر المنثور: ص ۱۰۳ ج ٦) اور یہ بات تو اپنی جگہ اہل اللہ کے ہاں متحقق ہے کہ نیک اعمال کی خوشبو ہوتی ہے اور برے اعمال کی بو ہوتی ہے۔ اور وہ بسا اوقات اس کا احساس بھی پاتے ہیں۔ میرے شیخ، بلکہ شیخ العرب والعجم حضرت محمد گوندلوی رحمہ اللہ نے جب اسی حوالے سے ایک بار بخاری شریف کے درس میں گفتگو کی تو راقم نے عرض کیا کہ کیا یہ بات نظریاتی ہے یا حسی و عملی بھی؟ تو انھوں نے ارشاد فرمایا: حسی طور پر بھی اس کا احساس ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا اس کی کوئی مثال؟ تو ارشاد فرمایا: زانی کے جسم سے اس طرح کی بو آتی ہے جیسے حقہ پینے والے کے منہ سے آتی ہے۔ اخی و محبی مولانا برق التوحیدی حفظہ اللہ نے ذکر کیا کہ اسی نوعیت کی بات دورانِ درس میں حضرت حافظ صاحب نے فرمائی تو میں نے عرض کیا کہ کوئی شخص ہے جس کو یہ احساس ہوتا ہے: تو انھوں نے فرمایا: ہاں! سید ابو بکر غزنوی رحمہ اللہ کو اس کا احساس ہوتا تھا۔ جب اہل اللہ یہ چیز محسوس کرتے ہیں تو فرشتے کا وجود تو انتہائی لطیف ہے۔ وہ اس کا احساس بالأولیٰ پاتے ہیں اور اسی بنا پر وہ نیکی کے ارادے کو لکھتے ہیں، اور برائی کے ارادے کو اللہ کے لطف و کرم کی وجہ سے نہیں لکھتے۔

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی تَجَاوَزَ لِأُمَّتِیْ عَمَّا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسُهَا مَالَمْ تَعْمَلْ أَوْ تَتَكَلَّمْ بِهِ. (بخاری: ۵۲۶۹، مسلم: ۳۳۲)

''اللہ تعالیٰ میری امت کو معاف کر دیتے ہیں جو ان کے دل میں خیالات آتے ہیں، جب تک ان کو زبان سے نہ کہا ہو، یا عمل نہ کیا ہو۔''

جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وساوس و خطرات کی معافی ہے تو ان کے لکھنے کا کیا

فائدہ؟ لیکن یہ حدیث ظاہر ہے کہ حسنات کے لکھنے کے تو منافی نہیں، کیونکہ اس میں بس سیئات کے خیالات کو معاف کرنے کا ذکر ہے۔ رہا ان کا لکھا جانا، تو حدیثِ سابق سے اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ انھیں اس کی اجازت نہیں، بلکہ جس حدیث میں دل کے خیالات کو معاف کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ وساوس وخطرات ہیں جو لوحِ قلب پر بغیر قصد وارادہ کے آتے جاتے ہیں، اور ایسے ہی غیر اختیاری خیالات کو اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا ہے۔ اللہ ﷻ نے جب حسبِ ذیل آیت نازل فرمائی:

﴿لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللَّهُ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (البقرۃ:۲۸۴)

''اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے اگر تم اس کو ظاہر کر دو یا اسے چھپائے رکھو، اللہ بہر حال تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت گھبرائے کہ اگر غیر اختیاری خیالات پر بھی مؤاخذہ ہوا تو کون نجات پائے گا، دل تو ہمارے ہاتھ میں نہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو کچھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اس کی اطاعت کا عزم کرو اور کہو ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ کہ ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یوں ہی کیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ آیت نازل فرمائی: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زائد تکلیف نہیں دیتا۔ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مطمئن ہو گئے۔ یہ روایت مختلف طرق سے صحیح مسلم، مسند امام احمد وغیرہ کتب میں منقول ہے اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے بھی اسے نقل کیا ہے، اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔

بعض حضرات نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس آیت میں ''حساب'' لینے کا ذکر ہے جبکہ حساب اور عقاب میں فرق ہے۔ حساب میں اگر مناقشہ نہ ہو تو اس میں عذاب کا پہلو نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَنْ نُوْقِشَ الْحِسَابُ هَلَكَ کہ جس کے حساب کا مناقشہ ہوا وہ ہلاک ہو گیا۔ (بخاری: رقم ۴۹۳۹) اور ایک حساب کی صورت محض پیش کرنے اور یاد دلانے کی ہے، مؤمنوں کے ساتھ تو یہی حساب ہو گا اور اسی کو قرآن مجید میں حساب یسیر سے تعبیر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو علیم بذات الصدور ہے انھیں یاد دلا کے معاف فرما دیں گے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ فرشتے صرف انسان کے قول و فعل کو ہی نہیں لکھتے، نیک ارادہ اور قصد کو بھی لکھتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ بُرے ارادہ کو وہ شمار و قطار کے لیے نہیں لکھتے، بلکہ انسان اگر اس کو اللہ کے ڈر سے چھوڑ دیتا ہے تو فرشتے ایک نیکی لکھ لیتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فرشتے صرف وہی عمل لکھتے ہیں جو خیر اور شر پر مبنی ہو ہر بول نہیں لکھتے۔ (حاکم وصححہ وغیرہ) جبکہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک قول یوں منقول ہے کہ فرشتے پہلے تو ہر بول اور ہر کلمہ لکھتے ہیں، مگر ہفتہ میں جمعرات کے دن ان نوشتوں پر نظر ثانی کی جاتی ہے، جن میں ثواب یا عقاب ہو انھیں باقی رہنے دیتے ہیں اور باقی کو محو کر دیتے ہیں۔ اور وہ فرماتے تھے کہ قرآنِ مجید میں ﴿يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتَابِ﴾ کا یہ بھی مفہوم ہے (ابنِ کثیر) اس قول سے اس اختلاف میں توفیق و تطبیق ہو جاتی ہے، اور جو حضرات فرماتے ہیں کہ جو قول ثواب و عقاب پر مبنی نہ ہو وہ نہیں لکھا جاتا، وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات کسی چیز کی ظاہر نعت و تعریف محذوف ہوتی ہے، جیسے ﴿وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا﴾ (الکھف: ۷۹) ''کہ ان کے پیچھے بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین لیتا تھا۔'' ظاہر ہے یہاں ہر کشتی نہیں، بلکہ وہی کشتی مراد ہے جو صحیح، درست اور قابلِ استعمال تھی۔ اسی طرح یہاں گو ﴿مَا يَلْفِظُ﴾ ہر لفظ کو شامل ہے، مگر مقصود وہی لفظ و عمل ہے جو جزا اور سزا سے وابستہ ہے، لیکن یہ بات تو اپنی جگہ درست اور حقیقت ہے کہ انسان کو بے فائدہ اور لایعنی قول و عمل کی اجازت نہیں اس کی زندگی بامقصد ہونی چاہیے، بے مقصد نہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں۔

یہاں یہ بات پیشِ نگاہ رہنی چاہیے کہ آیت میں زبان کے بول اور لفظ کو لکھنے کا ذکر کرنے سے زبان کی اہمیت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انسان بسا اوقات ایسا کلمۂ خیر بولتا ہے جس سے اللہ راضی ہو جاتا ہے، مگر انسان اسے معمولی سمجھتا ہے، اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا اجر وثواب کس قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اپنی رضا قیامت تک کے لیے لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح انسان کوئی کلمہ معمولی سمجھ کر اللہ کی ناراضی کا بولتا ہے، اسے گمان نہیں ہوتا کہ اس کا وبال کس قدر ہے، اللہ تعالیٰ اس کے سبب اس کے لیے اپنی ناراضی قیامت تک کے لیے لکھ دیتے ہیں۔ (احمد، ترمذی: رقم ۲۳۱۹ وحسنہ وصححہ وابنِ ماجہ، ابنِ کثیر) حضرت علقمہ رحمہ اللہ جو یہ حدیث حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ اس حدیث نے بہت سی باتیں کرنے سے روک دیا ہے۔ زبان کا ایک بول انسان کی عزت ووقار کا باعث بنتا ہے، جبکہ ایک بول اسے ذلت ورسوائی کی پسپائی میں دھکیل دیتا ہے۔ زبان کی اسی اہمیت وحیثیت کی بنا پر، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے جسم کے باقی اعضاء ہر روز صبح اس کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ سے ڈر، اس لیے کہ ہم تیرے ساتھ وابستہ ہیں، اگر تو درست رہے گی ہم بھی درست رہیں گے۔ اگر تو کج رو ہو گی تو ہم بھی کج رو ہو جائیں گے۔ (ترمذی: رقم ۲۴۰۷ حسن وصححہ ابن خزیمہ) زبان کی حفاظت کے بارے میں بہت سی احادیث مبارکہ کتب احادیث میں موجود ہیں جن کا استیعاب مشکل بھی اور اطناب کا باعث بھی۔ شائقین الترغیب والترہیب (ص ۵۲۱، ۵۴۳ ج ۳) ملاحظہ فرمائیں۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ''کلام'' انسان کا قیدی ہے اور جب یہ زبان سے نکلتا ہے تو انسان اس کا قیدی بن جاتا ہے۔ زبان کی دو بڑی آفتیں ہیں، ایک سے اگر بچ گیا تو دوسری سے بچنا مشکل ہے، ایک آفت کلام ہے اور دوسری آفت خاموشی وسکوت ہے، اور یہ دونوں گناہ میں ایک دوسری سے بڑھی ہوئی ہیں۔ کلمۂ حق سے ساکت رہنے والا گونگا شیطان ہے، مداہن ہے اور اللہ کا نافرمان ہے، کیونکہ نہی عن المنکر سے وہ خاموش رہا،

بلکہ بعض اوقات اسی بنا پر افضل الجہاد کی سعادت سے محروم رہتا ہے۔ جبکہ باطل اور غلط بات زبان پر لانے والا شیطان ناطق ہے اور اللہ کا نافرمان ہے، اکثر لوگ انھی دو آفتوں میں پھنسے ہوئے ہیں، صراطِ مستقیم پر وہ ہیں جو درمیانی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں جو باطل سے کفِ لسان کا اہتمام کرتے ہیں اور وہی بول بولتے ہیں جو آخرت میں انھیں نفع دینے والے ہیں، وہ بے فائدہ کلام نہیں کرتے، چہ جائیکہ وہ کلام کریں جو اس کے لیے آخرت میں نقصان کا باعث ہو۔ انسان قیامت کے دن پہاڑوں کے برابر بڑی بڑی نیکیاں لے کر آئے گا، مگر دیکھے گا کہ اس کی زبان کی آفتوں نے انھیں ملیامیٹ کر دیا ہے۔ اور یوں بھی ہو گا کہ قیامت کے دن پہاڑوں جیسے بڑے بڑے گناہ لے کر آئے گا، مگر زبان سے کثرتِ ذکر کی بدولت وہ سب ختم ہو جائیں گے۔ (الجواب الکافی)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کی ایک ذمہ داری کا ذکر ہے کہ دو نگران فرشتے ہر انسان کا نامۂ اعمال لکھنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے کچھ فرشتے وہ ہیں جو انسان کی حفاظت پر مأمور ہیں۔ بعض وہ ہیں جو قیام میں، کچھ رکوع میں، کچھ سجود میں اور کچھ بیٹھے ہوئے اللہ کی تسبیح و تہلیل و تکبیر میں مصروف ہیں،، کچھ وہ ہیں جو حاملینِ عرش ہیں، کچھ وہ ہیں جو عرش کا طواف کرتے ہیں، وہ بھی ہیں جو بیتِ معمور کا طواف کرتے ہیں۔ اور وہ بھی ہیں جو اللہ کے حکم سے دنیا کے نظام و انصرام میں مصروف ہیں۔ غرض یہ کہ ہر ایک کی ایک نہ ایک ڈیوٹی اور ذمہ داری ہے، جسے وہ بہر نوع پوری کر رہے ہیں۔ قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ میں فرشتوں کا ذکر اور ان کی ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے اور ان پر ایمان لانا ہمارے ایمان کا حصہ ہے، فرشتوں کا وجود محض تصوراتی نہیں اور نہ ہی کسی قوتِ ملکی یا ستاروں یا اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں کا نام ہے جیسا کہ بعض تجدد پسندوں اور ملحدوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ ایک نورانی غیر مرئی مخلوق ہے، بعض فرشتوں کا تو قرآن و احادیث میں نام بنام ذکر ہے اور ان کی ذمہ داریوں کا بھی ذکر ہے، اور ان پر ایمان، ایمان بالغیب کا ایک حصہ ہے۔

انسان کا نامۂ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو ﴿رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ کہا گیا کہ وہ بڑے مستعد نگران ہیں، گویا انسان ان کی نظروں میں ہے وہ انسان کو دیکھتے ہیں، مگر انسان ان کو

نہیں دیکھ سکتا، البتہ قیامت کے روز انسان فرشتوں کو دیکھے گا۔ دنیا میں انسان اپنی آنکھ اور بینائی کی کمزوری کی بنا پر انھیں نہیں دیکھ سکتا، بلکہ مضبوط ترین خردبین کے ذریعے سے بھی انھیں دیکھنے سے قاصر ہے۔ مگر قیامت کے دن انسان کی بینائی تیز اور طاقت ور کر دی جائے گی تو وہ فرشتوں کو اور جنوں کو بھی دیکھے گا، بلکہ مومن اللہ ﷻ کے دیدار سے بھی مشرف ہوگا۔ اس میں بھی اللہ ﷻ کی تقسیم اور قدرتِ کاملہ کا اظہار ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو جس قدر چاہتا ہے جیسے چاہتا ہے قوت وطاقت عطا فرماتا ہے، اور جس کی جس طرح چاہتا ہے ذمہ داری اور ڈیوٹی لگا دیتا ہے، یہ سارے اختیارات اسی خالق ومالک اور قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہیں۔

اس آیت میں یہ سبق بھی ہے کہ انسان جب یہ سمجھتا ہے کہ مجھ پر دو نگران مقرر ہیں اور وہ میری ہر بات اور ہر عمل کا ریکارڈ جمع کر رہے ہیں، یہی نامۂ اعمال روزِ قیامت میرے سامنے کھلی کتاب کی مانند ہوگا اور اللہ ﷻ کے حضور حاضر کر کے اسے کہا جائے گا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھو، باوجودیکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں پھر بھی اس انتظام واہتمام کا ذکر انسان کے لیے زجر وتوبیخ اور اللہ سے شرم وحیا کے پہلو سے نافرمانیوں سے بچنے کا باعث ہے۔ اور مجرمین کے لیے انصاف کے تمام تر پہلوؤں کو پورا کرنے کا ایک تقاضا ہے۔

حافظ سیوطی رحمہ اللہ نے الدرالمنثور (ص ۱۰۵ ج ۶) میں ابوالشیخ کی کتاب العظمۃ اور شعب الایمان کے حوالے سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے دو فرشتے مقرر کیے ہیں جو انسان کا نامۂ اعمال لکھتے ہیں، انسان جب مر جاتا ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب! انسان مر گیا اب ہمیں اجازت دیں کہ ہم آسمان پر چلے جائیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں آسمان تو فرشتوں سے بھرا ہوا ہے جو میری تسبیح کر رہے ہیں۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہم زمین پر رہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میری زمین میری مخلوق سے بھری ہوئی ہے جو میری تسبیح کرتی ہے۔ فرشتے پوچھتے ہیں پھر ہم کہاں رہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم میرے اس بندہ کی قبر پر رہو اور تم اللہ اکبر، لا إلہ إلا اللہ، سبحان اللہ پڑھو اور اس میرے بندے کے صحیفۂ اعمال میں قیامت تک

لکھتے رہو۔

مگر یہ روایت سخت ضعیف ہے، کتاب العظمۃ (ص ۹۷۹ ج ۳) میں یہ روایت عثمان بن مطر کی سند سے ہے جو ضعیف ہے، بلکہ امام ابن حبان رحمہ اللہ فرمایا کہ وہ گھڑی ہوئی روایتیں ثقہ راویوں سے بیان کرتا ہے اور حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ نے اسی بنا پر اسے الموضوعات (ص ۲۲۹ ج ۳) میں ذکر کیا ہے۔

بلکہ یہ روایت صحیح حدیث کے بھی معارض ہے کہ جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے (۱) نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔ (۲) صدقۂ جاریہ (۳) اس کا علم جس سے لوگ فائدہ اٹھائیں۔ (مسلم رقم: ۴۲۲۳) مگر اس میں قیامت تک فرشتوں کی تسبیحات کا ثواب انسان کے نامۂ اعمال میں لکھنے کا ذکر ہے، بلکہ یہ تو قرآن پاک کی اس آیت کے بھی منافی ہے کہ ﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰى﴾ (سورۃ النجم: ۳۹) کہ انسان کو اس کے عمل کا ہی بدلہ ملے گا۔

﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾ (۱۹)

''اور موت کی بے ہوشی حق لے کر پہنچ گئی، یہ وہی ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔''

﴿سَكْرَةُ﴾ ''السُّكر'' سے ہے، یہ اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، اور اس کا عمومی اطلاق نشہ آور چیز کی بدمستی و مدہوشی پر ہوتا ہے اور اسی سے سَكَرَاتُ الْمَوْتِ موت کی بے ہوشیاں، اس مدہوشی اور غشی کا سبب ہے موت کے وقت دم گھٹنا، پیاس کی شدت، اختلالِ دل و دماغ، کمزوری و بے بسی اور اگر کافر ہو تو ساتھ ڈراونی شکل میں فرشتوں کو دیکھنا، ان کا مارنا، ڈانٹنا، ان میں تو ہر ایک چیز غشی کا باعث ہے، مگر میت ہے جو بیک وقت ان سے دوچار ہوتی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر جب موت کے آثار نمودار ہوئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بلایا، وہ آئیں تو بے ساختہ زبان سے یہ شعر نکلا۔

إِذَا حَشْرَجَتْ يَوْمًا وَضَاقَ بِهَا الصَّدْرُ

''یعنی جب ایک دن روح مضطرب ہوگی اور سینہ اس سے تنگ ہو جائے گا۔''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سنتے ہی فرمایا: تم نے یہ فضول شعر کہا۔ یوں کہو ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾. یہ بھی منقول ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ پر انتقال کے وقت جب غشی طاری ہوئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ شعر کہا:

مَنْ لَا يَزَالُ دَمْعُهُ مُقْنِعًا

فَإِنَّهُ لَا بُدَّ مَرَّةً مَدْفُوقٌ

''جس کے آنسو ہمیشہ رُکے رہے ایک بار تو ضرور وہ بہہ نکلیں گے۔''

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سر اٹھایا اور فرمایا یوں نہ کہو، بلکہ کہو: ﴿وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ﴾ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ

واقعہ متعدد طرق سے منقول ہے، جنھیں میں نے ''سیرۃ الصدیق'' میں جمع کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں صحیح بخاری وغیرہ میں ہے کہ جب آپ پر آخری وقت آیا تو آپ پانی میں ہاتھ ڈال کر چہرۂ انور پر ملتے اور فرماتے تھے لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰـهُ إِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٍ (بخاری: ۴۴۴۹) موت کی غشی اور جان کنی کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہی فرمان ہے کہ لَا أَكْرَهُ شِدَّةَ الْمَوْتِ لِأَحَدٍ أَبَداً بَعْدَ النَّبِيِّ ﷺ کہ نبی کریم ﷺ کے بعد کسی پر موت کی سختی کو ناگوار نہیں جانتی۔ (بخاری: ۴۴۴۶) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ سے پوچھا موت کے بارے میں بتلاؤ، انھوں نے فرمایا: امیر المؤمنین اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک بہت کانٹے دار پودا انسان کے پیٹ میں پیوست ہو جاتا ہے اور اس کی ہر رگ اور جوڑ میں کانٹے ہیں اور طاقت ور انسان ان سے اپنے آپ کو بچاتا اور کھینچتا ہے۔ (ابن ابی شیبہ وغیرہ)

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت مسند امام احمد وغیرہ میں مروی ہے، جس میں احوالِ میت و برزخ کا بیان ہے، اس روایت میں کافر کی قبضِ روح کے بارے میں ہے کہ سیاہ رو فرشتے اپنے ساتھ ٹاٹ لیے ہوئے جہاں تک نظر جا سکتی ہے، اتنی دور سے میت کو گھیر لیتے ہیں۔ اس کے بعد ملک الموت آتے ہیں اور اس کے سرہانے بیٹھ کر کہتے ہیں اے خبیث روح! نکلو اللہ کے غضب کی طرف۔ یہ سن کر جان بدن میں چھپ جاتی ہے، اس وقت وہ جان کو اتنی شدت سے نکالتے ہیں جس طرح آہنی سیخ تر کپڑے سے کھینچی جاتی ہے، وہ اس کی روح نکالتا ہے اور دوسرے فرشتے پلک جھپکنے میں اسے لے لیتے ہیں اور اس روح سے مردار کی سی بو آتی ہے۔ (مسند احمد: ص ۲۸۸ ج ۴ وغیرہ)

قرآنِ مجید میں بھی ہے کہ کاش تم ظالموں کو موت کی بے ہوشی میں دیکھو، فرشتے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کہتے ہیں: اپنی جانیں نکالو اب تمھیں ذلت آمیز سزا دی جائے گی۔ (الانعام: ۹۳) اس حال میں فرشتے انھیں ماریں گے بھی، چنانچہ فرمایا: ﴿فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ﴾ (محمد: ۲۷) ''ان کا کیا حال ہو گا جب فرشتے ان کی روح نکال رہے ہوں گے اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے

ہوں گے۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب سے انسان پیدا ہوتا ہے تب سے لیکر اس کے لیے موت سے زیادہ سخت اور کوئی چیز نہیں پھر اس کے بعد انسان سے جو معاملات ہونے والے ہیں، ان کے مقابلے میں موت بہت ہلکی ہے۔'' (مسند احمد: ۱۵۴ ج ۳ ورجالہ موثقون المجمع: ص ۳۱۹ ج ۲)

موت کی یہ تنگی و بے ہوشی ''الحق'' کو لیکر آئی۔ ''الحق'' سے مراد یہاں قیامت ہے۔ یعنی موت، قیامت کا پیغام لے کر آئی، موت کے آغاز ہی میں وہ چیزیں سامنے آجاتی ہیں جو حق و سچ ہیں۔ ایک ضعیف حدیث میں ہے: مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِیَامَتُہٗ جو موت کے منہ میں آ گیا اس کی قیامت آ گئی۔ (المقاصد: ۴۲۸)

مرنے والا فرشتوں کو دیکھ لیتا ہے وہ جس شکل و صورت میں آتے ہیں مرنے والا اسی سے اپنے انجام کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ وہ اہلِ سعادت میں سے ہے یا اہلِ شقاوت میں سے، موت کے بعد برزخ کی زندگی قیامت کی تمہید ہے اور اس کے ساتھ ہی عالمِ آخرت کے احوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں ہے:

﴿كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيلَ مَنْ رَاقٍ ۝ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ۝﴾

(القیامۃ: ۲۶۔۳۰)

''ہرگز نہیں، جب جان حلق تک پہنچ جائے گی، اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا اور آدمی سمجھ لے گا کہ یہ دنیا سے جدائی کا وقت ہے، اور پنڈلی سے پنڈلی جڑ جائے گی، وہ دن تیرے رب کی طرف روانی کا ہوگا۔''

اس صورت حال سے تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور پتہ چل جائے گا کہ وقتِ موعود آ پہنچا ہے۔

یا ﴿بِالْحَقِّ﴾ سے مراد یہاں موت ہے، جس کا آنا بہر نوع حق ہے، یا یہاں ﴿بِالْحَقِّ﴾ سے حقیقت یا برحق مراد ہے جو عبث کی ضد ہے، جیسے فرمایا: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ (التغابن: ۳) کہ آسمانوں اور زمین کو برحق بنایا۔ یعنی موت کی مدہوشی حقیقتاً

آ پہنچی۔ قیامت، حساب کتاب اور جنت وجہنم کی جو باتیں سنتے تھے ان کی صداقت ظاہر ہوگئی، اور اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ دنیا دارِفانی ہے دارالخلد نہیں۔ ہمیشہ کی زندگی تو آخرت کی ہے۔

﴿ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْهُ تَحِیْدُ﴾ ''یہ ہے جس سے تو بھاگتا اور کنی کتراتا تھا۔'' ﴿تَحِیْد﴾ کے معنی پہلوتہی کرنے، کنی کترانے، بچنے اور بھاگنے کے ہیں۔ انسان اس سے بچاؤ کا ہر حیلہ اختیار کرتا ہے حتی کہ اپنے لیے دوسرے انسانوں کو ڈھال بناتا ہے اور ہر اس چیز سے گریز کرتا ہے جو موت کا باعث ہو، مگر موت ہے کہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور ہر طرح کے بچ بچاؤ کے باوجود وقت مقرر پر آدھمکتی ہے۔ موت سے ہر شخص الا ماشاء اللہ بچنے کی تدبیر کرتا ہے اور یہ بچنا ممنوع بھی نہیں، مگر یہاں مقصود یہ ہے کہ موت سے بچنے کی کوشش کے باوجود یہ ایک نہ ایک دن آکے رہے گی، اس سے بچنے کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی اور انسان موت کے منہ میں چلا جائے گا۔ ارشاد فرمایا:

﴿أَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ﴾ (النساء:۷۸)

''تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم تک پہنچ جائے گی اگرچہ تم مضبوط قلعوں اور محلوں میں رہو''

اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی بڑے سے بڑا ملحد ومعاند بھی انکار نہیں کرسکا اور نہ ہی کوئی اس سے انکار کرتا ہے۔ ہر روز انسان اس کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرتا ہے اس لیے انکار کیسے اور کیونکر؟ رہ گیا موت کے بعد کے انجام اور قیامت کا انکار، تو مرنے والا مرتے دم اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے، مگر اس وقت ایمان وایقان کی مہلت کا وقت ختم ہو چکا ہوتا ہے۔

اس آیت میں تمام انسان مخاطب ہیں۔ مگر اولاً مقصود یہاں مشرکین ویہود تھے کیونکہ وہی دراصل موت سے زیادہ گھبراتے اور زندگی کے طلب گار تھے، جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیَاةٍ وَمِنَ الَّذِیْنَ أَشْرَکُوْا یَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ﴾ (البقرة:۹۶)

''آپ ان کو ضرور پائیں گے تمام لوگوں سے بڑھ کر حرص کرنے والے

دنیا کی زندگی پر، اوران سے بھی جو شرک کرتے ہیں، آرزو کرتا ہے ہر ایک ان میں سے کہ کاش وہ عمر دیا جائے ہزار سال۔''

اور یہود کے بارے میں فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِیْكُمْ﴾ (الجمعۃ:۸)

''فرما دیجیے کہ جس موت سے تم بچتے ہو وہ تمہیں ملنے ہی والی ہے۔''

ان کا یہ فرار اس لیے تھا کہ وہ اسی دنیا کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے اور جو کچھ وہ یہاں اپنے ہاتھ سے بور ہے تھے اس سے بھی وہ آگاہ تھے اس لیے ان کی تمنا یہی تھی کہ یہاں دیر تک زندہ رہیں۔ یہاں گو مخاطب یہود و مشرکین تھے، مگر آیات اپنے عموم کے اعتبار سے تمام کفار کو شامل ہیں۔ ان کے برعکس بندۂ مومن میں موت کا طبعی خوف اور ڈر ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ اس سے بچاؤ کی کوشش کرتا ہے، مگر اس میں جزع وفزع کی کیفیت نہیں ہوتی، بلکہ ایمان وعمل صالح کی بنا پر اللہ کی رحمت کا امیدوار اور دیدارِ الٰہی کا مشتاق ہوتا ہے۔ زندگی کا طلبگار رہوتا ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے کچھ اور کام کرسکوں اور اگر ایمان وعمل میں خلل کا خطرہ محسوس کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے خاتمۂ خیر کی تمنا کرتا ہے۔ اور پکار اٹھتا ہے۔ ﴿تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّأَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ﴾ ''مجھے مسلمانی میں موت دے اور صالحین کے ساتھ ملا دے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل بڑی جامع دعا بیان کرتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْأَلُكَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاكِیْنِ وَأَنْ تَغْفِرَلِیْ وَتَرْحَمَنِیْ وَإِذَا أَرَدْتَّ فِتْنَةً فِیْ قَوْمٍ فَتَوَفَّنِیْ غَیْرَ مَفْتُوْنٍ ۔ (ترمذی: رقم ۳۲۳۵ فی تفسیر سورۂ صٓ، مسند احمد: ص ۲۴۳ ج ۵)

''اے اللہ میں آپ سے اچھے کام کرنے اور برے کام چھوڑ دینے اور مسکینوں سے محبت کرنے کی توفیق طلب کرتا ہوں، اور مجھے معاف فرما دیجیے اور مجھ پر رحم فرمائیے، اور آپ جب قوم کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنے کا فیصلہ فرمائیں تو فتنہ سے بچا کر مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔''

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ﴾ (۲۰)

''اور صور میں پھونکا جائے گا یہ ہے وعید کا دن۔''

﴿الصُّوْرِ﴾ سے مراد ''قرن'' یعنی نرسنگھے یا بگل کی طرح کی کوئی چیز مراد ہے جس میں حضرت اسرافیل علیہ السلام پھونک ماریں گے۔ قرآنِ مجید میں اس ''قرن'' کو ﴿نَاقُوْر﴾ بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ المدثر (۸) میں ہے: ﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ﴾ جب صور میں پھونک ماری جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھنے لگا ''صور'' کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''قَرْنٌ يُنْفَخُ فِيْهِ'' وہ قرن ہے جس میں پھونکا جائے گا۔ (ابوداود، ترمذی وحسنہ: رقم ۲۴۳۰ وابن حبان) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعمتیں کیسی؟ صاحبِ صور نے قرن کو منہ سے لگا رکھا ہے اس نے اپنی پیشانی جھکا رکھی ہے اور اپنے کان پھونکنے کے حکم کے انتظار میں لگا رکھے ہیں کہ صور پھونکنے کا کب حکم ملتا ہے؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یہ سن کر گھبرا گئے اور آپ سے عرض کیا کہ ہمیں کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: تم یوں کہا کرو: حَسْبُنَا اللّٰهُ نِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا

(ترمذی وحسنہ: رقم ۲۴۳۱ ابن حبان وغیرہ)

علامہ القرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے التذکرۃ میں فرمایا ہے کہ بعض گمراہوں نے ''صور'' کے ''قرن'' ہونے کا انکار کیا ہے اور ان کا یہ انکار اسی طرح ہے جیسے پل صراط اور وزنِ اعمال کا انکار کیا گیا اور اس کی مختلف تاویلیں کی ہیں: جس طرح میزان کے بارے میں ہے ساتوں آسمان اور زمین اس کے پلڑے میں آجاتے ہیں اسی طرح ''قرن'' کے بارے میں ہے کہ اس کا دائرہ آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔

علامہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ اور حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی رائے ہے کہ یہ صور تین بار پھونکا جائے گا پہلا نفخہ، نفخۃ الفزع ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ﴾ (النمل:٨٧)

''اور جس روز صور میں پھونکا جائے گا تو سب ڈر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنھیں اللہ تعالیٰ اس خوف وڈر سے بچالے۔''

اس پہلی بار صور پھونکنے کے نتیجہ میں سب پر سراسیمگی اور خوف طاری ہو جائے گا۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: کہ اس وقت زمین کی حالت اس کشتی کی مانند ہوگی جو دریا کے تلاطم سے ڈگمگا رہی ہو، یا اس معلق قندیل کی طرح ہوگی جسے تیز ہوا بُری طرح جھنجھوڑ رہی ہو۔ (ابن ابی حاتم، طبری، طبرانی) اس کے بعد دو نفخے ہیں ایک کو نفخۂ صاعقہ اور دوسرے کو نفخۂ قیام کہا گیا ہے۔ (ابن کثیر: ص۵۰۲ ج۳) نیز النھایہ جلد اول۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی البدور السافرۃ (ص۳ ج۵) میں تین نفخوں کا ہی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾

(الزمر:٦٨)

''اور صور پھونکا جائے گا تو سب مر جائیں گے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سوائے ان کے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے، پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو وہ سب اٹھ کر دیکھنے لگیں گے۔''

اس آیت میں ﴿ثُمَّ نُفِخَ﴾ سے تیسرا نفخہ مراد ہے، جس کا ذکر علیحدہ طور پر بھی قرآنِ مجید میں آیا ہے:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ ○ قَالُوْا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○ إِنْ كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَإِذَا هُمْ جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ○﴾ (یٰسٓ:٥١، ٥٢، ٥٣)

''اور پھونکا جائے گا صور میں تو یہ سب اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لیے قبروں سے نکل پڑیں گے۔ گھبرا کے کہیں گے ہائے افسوس! کس نے ہمیں ہماری قبروں سے اٹھایا ہے یہ وہی ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا اور رسولوں کی بات سچی تھی۔ ایک ہی زور کی آواز ہوگی اور سب ہمارے سامنے حاضر کر دیے جائیں گے۔''

مگر امام قرطبی رحمہ اللہ نے التذکرۃ (ص ۲۲۶، ۲۳۸) میں صرف دو نفخوں کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ نفخۃ الفزع ہی نفخۃ الصاعقہ ہے۔

انھوں نے اس پر صحیح مسلم (ص ۴۰۳ ج ۲) اور مسند امام احمد (ص ۱۶۶ ج ۲) میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں ذکر ہے کہ:

ثُمَّ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَلَا يَسْمَعُهُ أَحَدٌ إِلاَّ أَصْغٰى لِيتاً وَرَفَعَ لِيتاً قَالَ وَأَوَّلُ مَنْ يَسْمَعُهُ رَجُلٌ يَلُوْطُ حَوْضَ إِبِلِهِ فَيَصْعَقُ وَيَصْعَقُ النَّاسُ ثُمَّ يُرْسِلُ اللّٰهُ مَطَراً كَأَنَّهُ الطَّلُّ فَيَنْبُتُ مِنْهُ أَجْسَادُ النَّاسِ ثُمَّ يُنْفَخُ فِيْهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُوْنَ .

''پھر صور میں پھونکا جائے گا جو بھی اس کی آواز سنے گا وہ اپنی گردن ایک طرف جھکا دے گا اور دوسری طرف بلند کرے گا۔ اور سب سے پہلے یہ آواز وہ آدمی سنے گا جو اپنے اونٹوں کا حوض لیپتا ہوگا۔ وہ اور دوسرے تمام لوگ مر جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا جیسے کہ وہ شبنم ہے جس سے لوگوں کے جسموں میں نمو آئے گی پھر دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو سب کھڑے ہو جائیں گے۔''

ظاہر ہے کہ اگر اس سے پہلے بھی کوئی نفخہ ہوتا تو پہلی بار نفخہ سننے کا ذکر اس روایت میں نہ ہوتا، بلکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ مَا بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ أَرْبَعُوْنَ ''کہ دو نفخوں کے مابین چالیس کا وقفہ ہوگا۔'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ چالیس دن یا چالیس سال مراد ہیں؟ انھوں نے فرمایا: یہ میں نہیں جانتا، گویا میں نے

بس چالیس کا لفظ ہی آپ ﷺ سے سنا ہے۔ اس سے بھی بظاہر دو نفخوں ہی کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے دونوں نفخوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہوگا۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں تین نفخوں کا ذکر ہے۔ جسے ابوالشیخ نے العظمۃ (ص۸۲۲ ج۳) میں مطولاً روایت کیا ہے علامہ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے النھایہ (ص۲۲۴ ج۱) اور علامہ القرطبی رحمہ اللہ نے التذکرۃ (ص ۲۳۶) میں بھی اسے ذکر کیا ہے۔ شیخ رضاء اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے کتاب العظمہ کی تخریج میں اس پر بڑی نفیس بحث کی ہے اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ اور علامہ البانی رحمہ اللہ سے اس کی تضعیف بیان کی ہے، اس لیے تین نفخوں کے ثبوت میں یہ روایت ہی صحیح نہیں ہے۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ علامہ ابنِ حزم رحمہ اللہ نے تو کہا ہے کہ چار نفخے ہوں گے مگر یہ بھی صحیح نہیں۔ فتح الباری (ص ۳۹۸ ج۱۱)۔ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور دیگر روایات کی بنا پر فرمایا ہے کہ دو ہی نفخے ہیں۔ (فتح الباری: ص ۳۷۰ ج ۱۱، ص ۴۴۶ ج ۶)

﴿یَوْمُ الْوَعِیْدِ﴾ وعید، ''وَعَدَ'' سے ہے جو خیر وشر دونوں کے لیے قرآنِ مجید میں مستعمل ہے، مگر ﴿الْوَعِیْدِ﴾ کا لفظ خاص طور پر شر، دھمکی اور تہدید کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں ان آیات میں اولین مقصود کفار ہیں اسی لیے یہاں لفظ ﴿الْوَعِیْدِ﴾ یعنی عذاب کا دن۔ کفار اور نافرمانوں کے لیے آیا ہے اور یہ قیامت کے دن کا نام ہے، قرآنِ مجید میں قیامت کے مختلف احوال کی بنا پر مختلف نام آئے ہیں:

۱۔ **القیامة:** نام اس مناسبت سے ہے کہ اس روز لوگ پروردگارِ عالم کے روبرو کھڑے ہوں گے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (المطففین: ۶) قیامت کا نام قرآن مجید میں (۷۰) بار آیا ہے۔

۲۔ **الساعة:** گھڑی، وقت جیسا کہ فرمایا: ﴿اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِیَةٌ لَّا رَیْبَ فِیْهَا﴾ (المؤمن: ۵۹) بے شک وہ وقت ضرور آنے والا ہے۔ یہ لفظ قرآنِ مجید میں اڑتالیس (۴۸) مرتبہ آیا ہے اور قیامت کے معنی میں چالیس (۴۰) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

۳۔ **یوم الدین:** لوگوں کو اس دن پورا پورا انصاف ملے گا۔ جیسے فرمایا: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (الفاتحہ:۴) مالک ہے انصاف کے دن کا۔

۴۔ **التلاق:** ملنے کا دن۔ نیک نیک سے اور بد بد سے ملے گا، جہنمی جہنم اور عذاب کے ملائکہ سے، جبکہ جنتی جنت اور حور وغلمان سے اور بندے اپنے پروردگار سے ملیں گے۔ ﴿يُلْقِى الرُّوْحَ مِنْ أَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ لِيُنْذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ﴾ (المؤمن:۱۵) ''اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے وحی اتارتا ہے، تاکہ ملاقات کے دن سے ڈرائے۔''

۵۔ **یوم البعث:** کہ اس روز لوگوں کو قبروں سے اٹھا کر محشر کی طرف لے جایا جائے گا۔ ﴿لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِىْ كِتَابِ اللّٰهِ إِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ﴾ (الروم:۵٦) ''بلاشبہ یقیناً تم اللہ کی کتاب میں اٹھائے جانے کے دن تک ٹھہرے رہے۔ سو یہ اٹھائے جانے کا دن ہے۔''

٦۔ **الحسرۃ:** کہ وہ دن کافروں کے لیے حسرت وغم کا دن ہوگا، دنیا میں نیک عمل نہ کرنے کا غم، فرمایا: ﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ﴾ (مریم:۳۹) انھیں حسرت کے دن سے ڈراؤ۔

۷۔ **یوم الحساب:** دنیا کے نیک وبد اعمال کے حساب کا دن۔ ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ﴾ (ص:٢٦) ''یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی راہ سے بھٹک جاتے ہیں، ان کے لیے سخت عذاب ہے اس لیے کہ وہ حساب کے دن کو بھول گئے۔''

۸۔ **یوم الفصل:** فیصلے کا یا جدائی کا دن۔ حق وباطل کا، کافر ومومن کا فیصلہ، ہر جماعت اپنے اعمال کے اعتبار سے جدا ہوگی۔ اور کافر ومومن کو جدا جدا کیا جائے گا۔ ﴿هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ﴾ (الصافات:۲۱) ''یہ ہے فیصلے کا دن جسے تم جھٹلاتے تھے۔''

۹۔ **یوم التناد:** نداد ینے، پکارنے کا دن۔ فرشتے کے صور پھونکنے کی آواز اور یہ آواز کہ

فلاں فلاں حساب کے لیے حاضر ہو۔ ﴿يَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ﴾ (المؤمن:٣٢) ''اے میری قوم میں تمھارے بارے میں تناد کے دن سے خوف کھاتا ہوں۔''

١٠۔ **یوم الجمع:** تمام مخلوق کے جمع ہونے کا دن۔ ﴿لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (الشوریٰ:٧) ''تاکہ تو بستیوں کے مرکز (مکہ والوں) کو ڈرائے اور لوگوں کو بھی جو اس کے اردگرد ہیں اور تو اکٹھا کرنے کے دن سے ڈرائے جس میں کوئی شک نہیں۔''

١١۔ **یوم التغابن:** ہار جیت کا دن۔ ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ (التغابن:٩) ''جس دن وہ تمھیں جمع کرنے کے دن کے لیے جمع کرے گا۔''

١٢۔ **یوم الوعید:** عذاب کا دن، جس کا ذکر اسی سورۂ ق (٢٠) میں ہوا ہے۔

١٣۔ **یوم الخروج:** قبروں سے نکلنے کا دن۔ جس کا ذکر اسی سورہ قٓ (٤٢) میں ہوا ہے۔

١٤۔ **الواقعة:** سختی کا دن واقعہ ہونے والا ﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ﴾ (الواقعہ:١،٢) ''جب سختی کا دن واقع ہونے والا واقع ہو جائے گا اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں۔''

١٥۔ **الحاقة:** اس لیے کہ اس میں جزائے اعمال سچ سچ واقع ہو گی۔ ﴿الْحَاقَّةُ ۝ مَا الْحَاقَّةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ﴾ (الحاقہ:١۔٣) ''سچ مچ واقع ہونے والی، وہ سچ سچ واقع ہونے والی کیا ہے، اور آپ کیا جانیں کہ وہ سچ مچ ہونے والی کیا ہے۔''

١٦۔ **الصاخة:** آواز کی سختی اور کرخت پن جو بہرہ کر دے، یہ صور اور جہنم کی آواز کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿فَإِذَا جَآءَتِ الصَّاخَّةُ﴾ (عبس:٣٣) پس جب سخت آواز آئے گی، اسی سے أَصَاخَ يُصِيْخُ ہے جس کے معنی ہیں آواز کی سختی جو بہرہ کر دینے والی ہو۔ (مفردات)

١٧۔ **القارعة:** کھڑکھڑانے والی، ''قرع'' کے معنی ہیں ایک چیز کو دوسری چیز سے مارنا

اور کھٹکھٹانا۔ آفت اور ہولناک حادثہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ ﴿ الْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ﴾ (القارعۃ:۱۔۳) ''کھڑکھڑانے والی، کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی، اور آپ کیا جانیں کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔''

۱۸۔ **الطامة الكبرى:** طم علی کذا، کے معنی ہیں ایسی بڑی آفت جو چھا جائے اور ڈھانپ لے، قیامت کو طامہ اس لیے کہا گیا کہ اس کی مصیبت سب پر چھا جائے گی، اس کے ساتھ الکبری لا کر مزید اس آفت کی شدت کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ﴾ (النازعات:۳۴) ''پھر جب بڑی آفت آئے گی۔''

۱۹۔ **یوم الآزفة:** قریب کا دن، قیامت کا دن گویا قریب ہے دور نہیں۔ ﴿وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ ﴾ (المؤمن:۱۸) ''ان کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ۔''

۲۰۔ **الغاشية:** ڈھانپنے والی، چھا جانے والی مصیبت کو کہتے ہیں۔ ﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ الْغَاشِيَةِ ﴾ (الغاشیۃ:۱) ''بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی یعنی قیامت کا حال معلوم ہے۔''

ان کے علاوہ بھی قرآنِ مجید میں قیامت کے نام آئے ہیں۔ اور کچھ نام وہ ہیں جو معانی و مفہوم کے اشتقاق کی بنیاد پر ہیں۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے البدور السافرۃ فی الأمور الآخرۃ (ص:۴۲) میں فرمایا ہے کہ قیامت کے تقریباً سو نام ہیں۔ انھوں نے ۷۷ نام ذکر کیے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے النہایہ (ص ۲۰۰، ۲۰۱ ج۱) میں حافظ عبدالحق الاشبیلی رحمہ اللہ کی کتاب العاقبۃ کے حوالے سے (۸۵) نام ذکر کیے ہیں۔ اہلِ عرب کے ہاں نام کی کثرت مسمی کی عظمت کی دلیل ہوتی ہے، اس اعتبار سے بھی قیامت کی عظمت واضح ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک تلوار کی اہمیت کی بنا پر ہی اس کے سات سو نام ہیں۔

﴿وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ﴾ (۲۱)

''اور ہر انسان آ گیا، اس کے ساتھ ایک ہانک کر لانے والا اور ایک گواہی دینے والا۔''

یہ روزِ قیامت انسان کی اللہ کی عدالت میں حاضری کی کیفیت کا بیان ہے کہ ایک فرشتہ ﴿سائق﴾ اس کے ساتھ چلانے والا یا ہانک کر لے جانے والا ہوگا جو اسے چلا کر حساب کے لیے پیش کرے گا۔ اور دوسرا فرشتہ ﴿شھید﴾ بطورِ گواہ ساتھ ہوگا، جو اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دے گا۔ یہی قول حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، قتادہ رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، اور آیت کے الفاظ بھی اسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ مگر ایک قول یہ ہے کہ سائق سے مراد فرشتہ اور شھید سے انسان کا عمل مراد ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ الشھید سے انسان کا اپنا نفس مراد ہے، اور بعض نے شھید سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعض نے نامۂ اعمال مراد لیا ہے، مگر یہ قول بداہتاً سیاقِ قرآن کے موافق نہیں۔ گو انسان کے حساب کتاب کے مناسبِ حال بطورِ گواہ اس کا نامۂ اعمال، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خود انسان کے اعضاء و جوارح اور زمین و مکان جہاں اس نے نیک یا برا عمل کیا ہوگا سب بطورِ گواہ پیش ہوں گے، لیکن پہلا مرحلہ حاضری کی کیفیت کا ہے جس کا اس آیت میں بیان ہے۔ یہ کیفیت بعینہ ویسی ہے جیسے عدالت میں لے جانے والے مجرم کی ہوتی ہے کہ ایک سپاہی مجرم کو لے جانے والا اور دوسرا سرکاری وکیل کی حیثیت سے اس کے جرائم و کوائف کی گواہی دینے والا ہوتا ہے۔ ان دونوں فرشتوں کے بارے میں بعض نے کہا کہ مراد وہ دو فرشتے ہیں جو ہر انسان کا ریکارڈ محفوظ کر رہے ہیں، اور بعض نے کہا نہیں یہ علیحدہ حیثیت سے دو فرشتے ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے سب سے جدا موقف اختیار کیا ہے، فرماتے ہیں کہ الشھید سے مراد وہ فرشتہ ہے جس کا ذکر پہلے قعید کے لفظ سے ہوا ہے۔ اور سائق سے

مراد وہ فرشتہ ہے جس کا ذکر المتلقی سے ہوا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ میں ''التلقی'' استقبال کے مفہوم میں ہے، اخذ کرنے اور حاصل کرنے کے معنی میں نہیں۔ مقصد یہ ہے المُتَلَقِّيَانِ سے وہ دو فرشتے مراد ہیں جو جان کنی کے بعد ملک الموت سے روح لے لیتے ہیں، ایک ان میں صالحین کی روح لینے والا ہوتا ہے اور دوسرا طالحین کی، اور وہ دونوں دائیں بائیں ''قعید'' بیٹھے نامۂ اعمال لکھنے والوں سے پوچھتے ہیں کہ یہ کس جانب اور کس قبیل کے ہیں۔ اگر وہ نیک ہے تو بخوشی فرشتہ روح ملک المسرور کو دے دیتا ہے اور اگر وہ گناہ گار ہوتا ہے تو افسوس سے روح ملک العذاب کو دے دیتا ہے۔ اسی تناظر میں وہ فرماتے ہیں کہ شہید سے مراد ''قعید'' نامۂ اعمال لکھنے والا ہے اور سائق سے ملک الموت سے روح لینے والا مراد ہے جو اسے اس کی برزخی منزل میں لے جاتا ہے، اور اس تاویل کو انھوں نے اقرب الی الفہم اور زیادہ معروف قرار دیا ہے۔ (التفسیر الکبیر)

واللہ تعالیٰ اعلم

﴿لَقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾(۲۲)

''بے شک تو اس کی طرف سے غفلت میں تھا، ہم نے تمھارے اوپر پڑے ہوئے پردے کو ہٹا دیا تو آج تیری نگاہ بہت تیز ہے۔''

قیامت کے دن اللہ کے ہاں پہنچ جانے پر اسے تنبیہ کی جائے گی کہ اس دن کے بارے میں تم شک میں پڑے ہوئے تھے۔ تمھاری غفلت دور کرنے کے لیے اللہ نے رسول بھیجے، حشر ونشر کے دلائل دیے، مگر تمھیں یقین نہ آیا، کاہنوں اور نجومیوں کی باتوں پر تمھیں یقین آتا تھا، مگر میرے سچے اور صادق رسولوں کی باتوں پر تمھیں یقین نہیں آتا تھا، مگر آج تمھاری آنکھیں کھل گئی ہیں اور وہ سب چیزیں دیکھ رہے ہو جن کا امکان تمھیں دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ اس آیت کا مخاطب کون ہوگا؟ بعض نے کہا کہ مراد کفار ہیں، ظاہر ہے کہ وہ اس کے اولین مصداق ومخاطب ہیں اور وہی کفِ افسوس ملیں گے جن کے بارے میں بتلایا گیا ہے:

﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ﴾(السجدۃ:۱۲)

''کاش تم وہ وقت دیکھو جب مجرم سر جھکائے اپنے رب کے حضور حاضر ہوں گے۔ (اور اس وقت کہہ رہے ہونگے) اے ہمارے رب! ہم نے خوب دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا، اب ہمیں واپس بھیج دیں تا کہ ہم نیک عمل کریں، ہمیں اب یقین آ گیا ہے۔''

کفار ہی کے بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَإِذَا هِيَ شَاخِصَةٌ أَبْصَارُ الَّذِينَ كَفَرُوا يَا وَيْلَنَا قَدْ كُنَّا فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا بَلْ كُنَّا ظَالِمِينَ﴾(الانبیاء:۹۷)

''اور وعدۂ حق کے پورے ہونے کا وقت قریب آ لگے گا تو یکا یک ان لوگوں

کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا، وہ کہیں گے ہائے ہماری شامت! ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے تھے، بلکہ ہم ظالم تھے۔''

غفلت کے اعتراف کے ساتھ اپنے ظلم کا اعتراف، حقیقت کا اظہار ہے کہ غفلت کیا، ہمیں تو اس سے خبردار کیا گیا تھا مگر ہم نے ایک نہ سنی اور اس کے انکار پر اڑے رہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کا مخاطب کافر و مومن دونوں ہوں گے۔ اسی قول کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے راجح قرار دیا ہے۔ مؤمن ہے تو یہ سارا منظر دیکھ کر اس کا یقین بڑھ جائے گا، جو جزئیات اس سے مخفی تھیں ان کا علم ہو جائے گا، اس لیے مومن بھی قیامت کی شدت پوری طرح معلوم نہ ہونے کی وجہ سے غافل ہی کی طرح ہے، بلکہ مسلمان بھی اکثر و بیشتر دنیوی مشاغل اور اس کی زیب و زینت میں مگن ہو کر اور تکاثر کی بیماری میں مبتلا ہو کر آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر علی العموم فرمایا گیا ہے:

﴿اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ﴾ (الانبیاء:۱)

''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا مگر وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔''

شیخ ابوالعتاہیہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

الناس في غفلاتهم　　　ورحى المنية تطحن

''موت کی چکی زور سے چل رہی ہے اور لوگ غفلتوں میں پڑے ہوئے ہیں۔''

ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے اس شعر کا تصور کہاں سے لیا ہے تو انھوں نے یہی آیت ﴿اقْتَرَبَ لِلنَّاسِ﴾ تلاوت کی اور فرمایا کہ اس آیت سے (ابن کثیر)۔ اس لیے آیت کے مفہوم میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ کفار میں یہ غفلت انکار کے پہلو میں ہے اور مسلمان میں تساہل و تکاثر کے اعتبار سے ہے۔

علاوہ ازیں آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حیثیت خواب و غفلت کی ہے اور آخرت کی مثال یقظہ اور بیداری کی ہے۔ خواب میں جس طرح انسان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور وہ کچھ نہیں دیکھتا اسی طرح دنیا میں آخرت کے حقائق کو وہ نہیں دیکھ سکتا، آخرت کے

مقابلے میں یوں دنیا خواب کی زندگی ہے، مگر یہ خواب کا عالم جب ختم ہوگا آنکھیں کھل جائیں گی تو سارے حقائق اس کے سامنے کھل جائیں گے۔ اور اسی لیے بعض اہلِ علم نے فرمایا ہے: اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَإِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا ''کہ اس دنیا میں انسان سوئے ہوئے ہیں جب مریں گے تو تب جاگیں گے۔'' قاضی ابنِ عطیہ اندلسی نے المحرر الوجیز میں اس جملہ کو بطورِ مرفوع روایت ذکر کیا ہے، مگر یہ صحیح نہیں۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے سلسلة الضعيفة (۱۰۲) میں فرمایا ہے لا أصل له یعنی مرفوعاً اس کی کوئی اصل نہیں۔

نظر کی اسی تیزی اور مضبوطی کی بنا پر تمام امورِ آخرت اس پر منکشف ہو جائیں گے۔ اپنی نیکیوں اور گناہوں کو دیکھے گا، جنت و دوزخ کا دور سے مشاہدہ کرے گا۔ اور مؤمن صادق جنت میں اپنے مولیٰ کے دیدار کا شرف پائے گا۔

ایک اشکال کا جواب

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ میں تو ذکر ہے کہ قیامت کے روز آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا جائے گا اور نگاہ تیز ہو جائے گی جبکہ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا﴾ الآیہ (الإسراء: ۹۷)

''ان کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ کر لائیں گے، اندھے، گونگے اور بہرے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَإِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمٰى ○ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْ أَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ○ قَالَ كَذٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾

(طٰہٰ: ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶)

''جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے معیشت تنگ ہوگی اور

قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا: اے میرے رب! دنیا میں تو میں آنکھوں والا تھا یہاں مجھے اندھا کیوں اٹھایا گیا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ہاں، اسی طرح تو ہماری آیات کو، جبکہ وہ تیرے پاس آئی تھیں، تو نے بھلا دیا تھا، اسی طرح آج تو بھلایا جا رہا ہے۔"

سورۂ طٰہٰ ہی میں ہے:

﴿يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا﴾ (طٰہٰ:۱۰۲)

"جس دن صور پھونکا جائے گا اور ہم مجرموں کو اس حال میں گھیر لائیں گے کہ ان کی آنکھیں پتھرائی ہوئی ہوں گی۔"

یہ آیات بظاہر اس آیت کے معارض معلوم ہوتی ہیں۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے، میدانِ محشر میں انسان کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کے بارے میں، فرمایا ہے کہ یہ اختلاف مختلف احوال کی بنا پر ہے۔ میدانِ محشر میں پانچ حالتیں ہوں گی:

۱۔ قبر سے نکلنے کی حالت اس حالت، میں کفار کے اعضاء و جوارح مکمل ہوں گے۔ تبھی وہ باہم باتیں کریں گے، جیسا کہ قرآن پاک میں ﴿يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (یونس:۴۵)، ﴿يَتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ (طٰہٰ:۱۰۳)، ﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ﴾ (المؤمنون:۱۱۲) الآیہ، آیا ہے۔

۲۔ دوسری حالت حساب کے لیے جانے کی ہے، اس وقت بھی وہ تمام حواس سے ہوں گے، یہاں ان سے سوال جواب ہوں گے، ظاہر ہے کہ وہ اس وقت گونگے، بہرے اور اندھے نہیں ہوں گے۔

۳۔ تیسری صورت محاسبہ کی ہوگی۔ اس حالت میں بھی وہ کامل جوارح سے ہوں گے، وہ اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے، ان کے اعضاء سے باز پرس ہوگی، اسی حالت میں وہ کہیں گے: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَلَا كَبِيْرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا﴾ (الکہف:۴۹) "اس کتاب کے لیے کیا ہے کہ اس نے کوئی کمی نہیں کی، چھوٹا، بڑا سب جمع کر دیا ہے۔"

۴۔ چوتھی حالت تب ہوگی جب انھیں جہنم میں لے جایا جائے گا، اس حالت میں وہ گونگے بہرے اور اندھے بنا دیے جائیں گے۔

۵۔ پانچویں حالت جہنم میں جانے کے بعد ہے، مگر یہ حالت اپنی ابتدائی اور آخری صورت کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ ابتدائی حالت جب وہ جہنم تک پہنچیں گے تب وہ اندھے بہرے ہوں گے، تا کہ ان کی ذلت میں اضافہ ہو اور دوسروں سے وہ ممتاز ہوں، انھی کے بارے میں غالباً یہ ارشاد ہے:

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْأَقْدَامِ﴾ (الرحمٰن:۴۱)

''مجرم اپنی نشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ تو انہیں پیشانی اور پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹ کر جہنم رسید کر دیا جائے گا۔'' (أعاذنا اللہ منہ) جہنم میں جانے کے بعد انھیں پھر کامل اعضاء وجوارح دے دیے جائیں گے، تا کہ وہ جہنم کا مشاہدہ کریں، اور جس کی تکذیب کرتے تھے اسے مکمل طور پر دیکھ لیں۔ یہاں ان کی باہم تو تکار ہوگی اور ایک دوسرے پر لعن وطعن کریں گے، اہلِ جنت کو پکاریں گے ان سے کھانے پینے کی اشیاء طلب کریں گے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں اس کی تفصیل ہے اور آخر کار وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ ہمیں یہاں سے نکالا جائے اگر ہم پھر یہی کچھ کریں تو ہم فی الواقع ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہیں ذلیل ورسوا ہو کر رہو اور بات نہ کرو۔ بالآخر موت کو مینڈھے کی صورت میں لا کر ذبح کیا جائے گا، اور جنتیوں سے کہا جائے گا تم ہمیشہ جنت میں اور جہنمیوں سے کہا جائے گا کہ تم ہمیشہ جہنم میں رہو گے۔ أعاذنا اللہ منہ۔

دنیا میں چونکہ انھوں نے کانوں، آنکھوں سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ دوسروں کو قرآنِ مجید اور دعوتِ حق سننے سے روکتے رہے، خود کہتے تھے ہمارے کانوں میں ''وقر'' بوجھ ہے، اپنا چہرا چھپا لیتے، کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے، زبان سے ایمان لانے کی بجائے دعوتِ حق کی تکذیب کرتے رہے، اسی بنا پر جہنم میں اور آخرت میں ان کو اندھا، گونگا اور بہرا کر دیا جائے گا۔ (التذکرۃ: ص ۲۵۰، ۲۵۲)

﴿وَقَالَ قَرِيْنُهُ هَذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ ٥ أَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ٥ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ٥﴾ (۲۳، ۲۴، ۲۵)

''اس کا ساتھی کہے گا یہ جو میری تحویل میں تھا ﴿عَتِيْدٌ﴾ حاضر ہے۔ (حکم دیا جائے گا) پھینک دو جہنم میں ہر ناشکرے معاند کو، خیر سے روکنے والے اور حد سے تجاوز کرنے، شک میں مبتلا ہونے والے کو''

امام مجاہد، حسن بصری اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ فرماتے ہیں ''قرین'' (ساتھی) سے مراد وہی ﴿سَائِقٌ﴾ ہے جس کی نگرانی میں انسان کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر کیا جائے گا اور وہی عرض کرے گا کہ یہ میری سپردگی میں تھا، لیجئے یہ حاضر ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ اور ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ﴿سَائِقٌ﴾ اور ﴿شَهِيْدٌ﴾ دونوں کے لیے عام ہے۔ جیسے کہ بعد کی آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے، کہ جب قرین وشہید اپنی ذمہ داری پوری کریں گے اور جرم ثابت ہو جائے گا تو ان دونوں سے کہا جائے گا کہ اسے جہنم میں ڈال دو۔ مگر ائمۂ ادب ولغت نے فرمایا ہے کہ تثنیہ کا صیغہ کبھی کلام عرب میں صرف تکرارِ فعل کے لیے ہوتا ہے۔ دو افراد مراد نہیں ہوتے جیسے مشہور جاہلی شاعر امرؤالقیس نے کہا ہے:

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرِ حَبِيْبٍ وَمَنْزِلِ

یہاں ''قفا'' سے دو ساتھیوں کا ٹھہرنا مراد نہیں، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ ٹھہرو، ٹھہرو محبوب اور محبوب کی منزل پر دو آنسو بہا لینے دو۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی فرمایا: کہ بعض عرب مفرد کو تثنیہ سے مخاطب کرتے ہیں، جیسا کہ حجاج نے کہا تھا یَا حَرَسِيْ اِضْرِبَا عُنُقَهُ ''اے سپاہی اس کی گردن اڑا دو۔'' اسی طرح ﴿أَلْقِيَا﴾ میں بھی دو کو حکم نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ڈال دو، ڈال دو اس کو، پھینک دو پھینک دو اس کو جہنم میں۔ بعض

کافر سے اپنی براءت کا اظہار کرے گا جیسا آئندہ آیت (۲۷) میں آرہا ہے چہ جائیکہ وہ مجرم کو خود لے کر حاضر ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ ہر ایک انسان کا ایک ''قرین'' ساتھی جن اور ایک ''قرین'' ساتھی فرشتہ مقرر کیا گیا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ! آپ کے ساتھ بھی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میرے ساتھ بھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلے میں میری مدد فرمائی ہے وہ مسلمان ہو گیا ہے اور وہ مجھے خیر کے علاوہ کوئی بات نہیں کہتا۔ (مسلم: ۲۸۱۰، ۲۸۱۴ وغیرہ) ممکن ہے اس آیت میں ''قرین'' سے مراد یہی فرشتہ ہو اور آیت (۲۷) میں ''قرین'' سے مراد شیطان جن ہو۔ واللہ اعلم

جہنم کی سزا جن جرائم کی بنا پر سنائی جائے گی ان میں یہاں پہلا جرم ''کفار'' بیان ہوا ہے، جو مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بڑا کافر، جس کے معنی ہیں حق کا انکار اور بہت ہی ناشکری کرنے والا۔ دوسرا جرم ﴿عَنِيدٍ﴾ ذکر کیا گیا۔ ﴿عَنِيدٍ﴾ کے معنی معاند، مخالف اور ضدی کے ہیں۔ گویا کافر اور ناشکرا ہی نہیں معاند بھی ہے۔ حق کو جان کر بھی حق کی مخالفت کرتا ہے، اور حق کو نیچا دکھانے کی پوری کوشش کرتا ہے گویا شیطان کی طرح، وہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے، کا مصداق ہے۔

تیسرا جرم یہ ہے کہ وہ ﴿مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ﴾ ''خیر سے بہت روکتا ہے۔'' ''خیر'' کا اطلاق ہر مرغوب اور پسندیدہ چیز پر ہوتا ہے، مثلاً عقل، عدل، مال اور تمام مفید اور نفع بخش چیزیں۔ اور آیت میں خیر سے مراد بعض نے مال لیا، کیونکہ بہت سی آیات میں مال پر اس کا اطلاق ہوا ہے، ملاحظہ ہو: البقرۃ (۱۸۰، ۲۱۵، ۲۷۲) العادیات (۸) وغیرہ۔ تو وہ گویا زکوٰۃ دینے صدقہ و خیرات کرنے سے روکتا ہے۔ یتیموں اور مسکینوں پر خرچ نہیں کرتا اور مال کی محبت میں سرشار رہتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ الفجر (آیت ۱۷ سے ۲۰) میں ہے اور سورۃ الحاقہ (آیت ۳۴) اور سورۃ الماعون (۳) میں بھی ہے: ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ﴾ (الحاقہ: ۳۴) ''اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا تھا۔'' حتیٰ کہ معمولی چیزیں دینے

سے بھی گریز کرتا تھا (الماعون: ۷) اسی طرح فرمایا: ﴿وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ٥ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ﴾ (حم السجدة: ۶، ۷) ”تباہی ہے ان مشرکوں کے لیے جو زکوٰۃ نہیں دیتے۔“ گویا یہ کافر و مشرک جہاں اللہ کا ناشکرا ہے وہاں اللہ کی راہ میں مال خرچ نہ کر کے مالی انعامات میں بھی ناشکری کرتا ہے۔ کفر کر کے یہ اللہ کا حق مارتا ہے اور زکوٰۃ اور مال خرچ نہ کر کے بندوں کا حق مارتا ہے، بلکہ یہ جہاں خود خیرات نہیں کرتا دوسروں کو بھی خیرات کرنے سے روکتا ہے۔ خود ہی بخیل نہیں دوسروں کو بھی بخیل بناتا ہے۔

بعض نے ”خیر“ سے مراد ایمان لیا ہے۔ جس کے خیر ہونے میں بھی کوئی ریب ہوسکتا ہے؟ گویا وہ خود ہی کافر اور ناشکرا نہیں، دوسروں کو بھی دولتِ ایمان سے روکتا ہے۔ اور اس سے روکنے کے لیے مختلف اسباب اختیار کرتا ہے۔ جیسے کفارِ مکہ کے سردار نضر بن حارث نے لونڈیاں خریدیں، شاہانِ عجم کے قصے، رستم و اسفندیار کی داستانیں لا کر قصہ گوئی کی محفلیں برپا کرنی شروع کر دیں تا کہ لوگ محمد رسول اللہ ﷺ سے قرآنِ مجید سننے اور آپ کی مجلسوں میں جانے سے رک جائیں۔ جس کسی کے بارے میں اسے پتا چلتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے متاثر ہو رہا ہے وہ اس پر اپنی لونڈی مسلط کر دیتا اور اسے کہتا کہ اسے خوب کھلاؤ پلاؤ، گانا سناؤ تا کہ یہ تیرے ساتھ مشغول ہو جائے اور اس کا دل رسول اللہ ﷺ سے ہٹ جائے، رسول اللہ ﷺ اگر لوگوں کو قرآن سنائیں تو مقابلے میں تم مجرا دکھاؤ اور محفلِ موسیقی سجاؤ، کافر کے عناد کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔

بلکہ ”خیر“ میں تمام امورِ خیر شامل ہیں، اور اُمت وسطیٰ کو تو حکم یہ ہے کہ وہ خیر کے داعی بنیں:

﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ (آلِ عمران: ۱۰۴)

”تم میں ایک جماعت ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی دعوت دے۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، یہ مومن کے اوصاف میں شامل ہے، مگر کافر و منافق منکر پھیلاتا، اس کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے اور معروف سے روکتا اور اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرتا ہے۔

﴿مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ﴾ چوتھا اور پانچواں جرم یہ ہے کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور شکی مزاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام میں جو حدود و قیود مقرر کر رکھی ہیں حکم تو یہ ہے ان کے قریب نہ جاؤ، مگر یہ وہ حدود پھلانگ جاتا ہے، حلال وحرام اور حقوق و فرائض جو مقرر کر رکھے ہیں ان کی کوئی پروا نہیں کرتا، اور ہے بھی شک وریب میں پھنسا ہوا، یہ شک قرآن کے بارے میں بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بھی اور قیامت کے بارے میں بھی، بلکہ قیامت کے بارے میں شک کا نتیجہ ہے کہ وہ ناشکرا کافر ہے، معاند ہے، بخیل ہے اور حدود سے تجاوز کر جانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مقررہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظَّالِمُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۲۹)

”یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ (الطلاق:۱)

”جو اللہ کی حدوں سے بڑھتا ہے وہ اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔“

ایک جگہ فرمایا:

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○﴾ (النساء:۱۳، ۱۴)

”یہ اللہ کی حدیں ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے جنت میں داخل کیا جائے گا جس کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ ہے سب سے بڑی کامیابی۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی

نافرمانی کرتا ہے اور اس کی حدود سے تجاوز کرتا ہے، اسے آگ میں داخل کیا جائے گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔''

حدود سے تجاوز کرنے والا عموماً متکبر بن کر ہی ایسا کرتا ہے اس لیے حسبِ حال اسے ذلت آمیز عذاب ہوگا اور ساری اکڑ نکل جائیگی۔

﴿مُّرِيْبٍ﴾ کے یہ معنی بھی ہیں کہ وہ شک میں مبتلا کرنے والا ہے، جیسے پہلے فرمایا کہ وہ بخیل ہی نہیں، بخل پر آمادہ بھی کرتا ہے، اسی طرح ﴿مُّرِيْبٍ﴾ خود بھی شک میں پڑا ہوا اور دوسروں کو شکوک وشبہات میں مبتلا کرنے والا اور حدودِ شرعیہ میں مصالح کی رعایت یا حالات کی ناموافقت کا الزام لگا کر شکوک وشبہات میں ڈالتا ہے یہ بھی گویا منعِ خیر ہی کی ایک کوشش ہے۔ منعِ خیر کی عموماً دو صورتیں ہوتی ہیں:

۱۔ جبر واکراہ سے

۲۔ شبہات ومغالطات سے

پہلی کا تعلق حکمرانوں اور دولتمندوں سے ہے، جبکہ دوسری کا تعلق تجدد پسندوں اور علماء وخطباے سوء سے ہے، جو انسانوں کے دلوں میں غلط وسوسے پیدا کرتے ہیں اور سلف صالحین سے ہٹ کر اپنے غلط افکار واعمال کے لیے نت نئے دلائل تراشتے ہیں۔ برعکس مومن صادق کے، کہ وہ ایمان پر پوری بصیرت سے قائم ہوتا ہے اور پوری بصیرت سے اس کی دعوت دیتا ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿قُلْ هٰـذِهِ سَبِيْلِيْٓ أَدْعُوْٓا إِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ (یوسف:۱۰۸)

''کہہ دیجئے یہ ہے میری راہ، میں اور میرے پیروکار پوری بصیرت سے اللہ کی دعوت دیتے ہیں۔''

﴿الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهاً آخَرَ فَأَلْقِیَاهُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ﴾(۲۶)

''جس نے اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بنائے، ڈال دو اس کو سخت عذاب میں''

یہ اس مجرم کا چھٹا جرم ہے کہ اس نے اللہ کے علاوہ دوسروں کو اپنا معبود بنایا تھا، اور یوں انھیں اللہ کی عبادت میں اللہ کا شریک بنالیا حتی کہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے۔

شرک فساد کی اصل جڑ ہے، اور یہی انسان کو تمام آلودگیوں میں مبتلا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے تمام انبیاے کرام علیہم السلام نے اپنی دعوت کا آغاز شرک کی بیخ کنی سے کیا، یہ اتنا گھناؤنا جرم ہے کہ اس کے علاوہ باقی تمام جرائم کی معافی اور کفارہ ممکن ہے، مگر قیامت کے دن شرک کی کوئی معافی نہیں۔ اس لیے انسان کو چاہیے شرک چھوڑ دے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ أَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ (النساء:۴۸،۱۱۶)

''اللہ مشرک کو معاف نہیں کرے گا اس کے علاوہ جسے چاہے گا معاف کر دے گا۔''

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿إِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ أَنْصَارٍ﴾ (المائدۃ:۷۲)

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جو اللہ کا شریک بنائے گا، اس پر اللہ نے جنت کو حرام کر دیا ہے، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار

نہیں ہوگا۔“

یہاں بھی ان مشرکوں کے لیے ”عذاب شدید“ کی وعید ہے، یہ ”شدید“ اس لیے بھی کہ اس میں انقطاع نہیں، جس عذاب میں انقطاع اور توقف ہو اس میں راحت و آرام کی کچھ توقع ہوتی ہے، جس کا مشرک مستحق نہیں۔ یہی ایسا ایک گھناؤنا جرم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے نہ کوئی نیکی قبول ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے مرتکب کے لیے دعا اور اپیل کارگر ہوسکتی ہے، بلکہ شرک کے ساتھ اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قیامت کو مانتا ہے تو اس کے ایسے ایمان کا بھی کوئی اعتبار نہیں۔ جب اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ فلاں تو اللہ کا بڑا محبوب اور چہیتا ہے وہ اللہ سے جو چاہے منوا سکتا ہے تو یہی تصور اسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی پر دلیر کرتا ہے اور قیامت کو تسلیم کر کے بھی اس سے بے خوف ہو جاتا ہے۔

علامہ الرازی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ﴿الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ﴾ ﴿كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ﴾ سے بدل ہے یا اس پر عطف ہے۔ یعنی ”کفار“ کی تفصیل و تشریح ہے یا یہ ﴿أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ﴾ پر عطف ہے۔ یعنی پہلے فرمایا کہ اس کو جہنم میں ڈال دو اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک بناتا ہے، جہنم میں ڈال کر اسے جہنم کا شدید عذاب پہنچاؤ، گویا مجرم پر فردِ جرم لگی اور جہنم کی سزا سنا دی گئی، مگر جب جرائم کی نوعیت بڑھتی گئی حتی کہ شرک بھی اس کے نامۂ اعمال میں پایا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ نے غصے سے فرمایا کہ اسے جہنم کے سخت عذاب میں ڈال دو۔

یہاں بھی ”فَأَلْقِيَاهُ“ تثنیہ استعمال ہوا ہے اور مراد یہ ہے کہ ڈال دو، ڈال دو۔ جیسے کہا جاتا ہے، پھینکو، پھینکو، جس میں اس کے مردود ہونے کا بھی اشارہ ہے، کہ یہ مشرک اسی کا سزاوار ہے۔

جنت کے جس طرح کئی درجات ہیں، اسی طرح جہنم کے بھی کئی درجات ہیں۔ اس کے سات دروازے ہیں اور سب سے ادنیٰ اور کم تر عذاب والے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ اسے جہنم کی دو جوتیاں پہنائی جائیں گی جن سے اس کا دماغ یوں کھولتا اور ابلتا ہوگا جیسے برتن میں گرم پانی ابلتا ہے۔ (بخاری) أعاذنا الله منها

﴿قَالَ قَرِيْنُهُ رَبَّنَا مَآ أَطْغَيْتُهُ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلَالٍ بَعِيْدٍ ○ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ إِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ○ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (۲۷، ۲۸، ۲۹)

''اس کا ساتھی کہے گا، اے ہمارے رب! میں نے اسے سرکش نہیں بنایا بلکہ یہ خود ہی پرلے درجے کی گمراہی میں مبتلا تھا، ارشاد ہوگا: میرے سامنے مت جھگڑو، میں نے تمھیں پہلے ہی وعید سے خبردار کر دیا تھا، میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔''

مجرم کو جہنم کی سزا سنا دینے کے بعد اس کا ''قرین'' (ساتھی) اپنی صفائی پیش کرے گا، ''قرین'' سے مراد یہاں شیطان ہے، سیاقِ کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ مجرم اللہ کی عدالت میں اسے موردِ الزام ٹھہرائے گا کہ یہ ظالم میرے پیچھے پڑا رہا، اسی نے مجھے سبز باغ دکھائے، اسی نے مجھے راہِ حق سے گمراہ کیا، شیطان کہے گا: جناب! میرا اس پر کنٹرول نہیں تھا، میں نے زبردستی تو اسے سرکش نہیں بنایا یہ تو خود ہی گمراہی میں اتنی دور نکل گیا تھا کہ اس کا پلٹنا مشکل تھا۔ یہاں شیطان کا یہ کہنا کہ ﴿مَا أَطْغَيْتُهُ﴾ میں نے اسے گمراہ نہیں کیا۔ حالانکہ اس نے تو کہا تھا: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ﴾ (سورۂ ص: ۸۲) ''تیری عزت کی قسم! میں ان تمام کو بالضرور گمراہ کروں گا۔'' ان دونوں میں بعض نے یہ توافق ذکر کیا ہے، کہ گمراہ کرنے کی بات تو اس نے اولادِ آدم سے انتقاماً کہی تھی، مگر جب عذاب کو دیکھا تو اپنی بات سے منحرف ہو گیا اور یہ کہنے لگا کہ میں نے گمراہ نہیں کیا اور بعض نے فرمایا ہے کہ ﴿مَا أَطْغَيْتُهُ﴾ کے معنی ہیں کہ یہ گمراہی ابتداءً میری طرف سے نہیں، میں نے اسے یہ پٹی پڑھائی کہ تم بالکل درست سمت پر چل رہے ہو اس کو چھوڑنا نہیں، گمراہی تو پہلے اس نے

خود اختیار کی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا تھا کہ شاباش لگے رہو۔

''قرین'' کا ذکر سورۃ الزخرف میں بھی ہے کہ:

''جو رحمان کے ذکر سے غفلت برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ''قرین'' یعنی رفیق بن جاتا ہے، یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہِ راست پر آنے سے روکتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں، آخر کار جب یہ شخص ہمارے ہاں پہنچے گا تو اپنے شیطان سے کہے گا کاش میرے اور تیرے درمیان مشرق و مغرب کا بُعد ہوتا، تو تو بدترین ساتھی نکلا۔ (الزخرف: ۳۶۔۳۸)

مگر آیت میں میدانِ محشر میں پہلے مرحلے کا اظہار ہے، دوسرے مرحلے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں پیشی کے وقت یہی ''قرین'' اپنی براءت کا اظہار کرے گا اور انسان کی اپنی گمراہیوں کے حوالے سے کہے گا کہ اس کی ضلالت پسندی کا نتیجہ تھا کہ میں نے اسے گمراہی کی ترغیب دی تو یہ مزید گمراہی میں پھنستا گیا۔ دوسرے مقام پر اس کی تفصیل یوں ہے:

﴿وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ مَّا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّٰلِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (ابراہیم: ۲۲)

''اور جب معاملے کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان کہے گا اللہ نے تمھارے ساتھ سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے وعدہ کیا تو میں نے اس کی مخالفت کی، مجھے تمھارے اوپر کوئی قوت و اختیار حاصل نہیں تھا، بس اتنی بات تھی کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری دعوت قبول کر لی، اس لیے تم مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ پر ملامت کرو، اور میں نہ تمھارے کام آنے والا ہوں نہ ہی تم میرے کام آؤ گے، اس سے پہلے جو تم نے مجھے شریک بنا رکھا تھا میں اس

کا انکار کرتا ہوں۔ بے شک ظالموں کے لیے ہی دردناک عذاب ہے۔"

سورۂ ابراہیم کی اس آیت سے پہلے کی آیت میں ذکر ہے کہ شیطان کی طرح قیامت کے دن قوم کے لیڈر، سردار، پیشوا اور حاکم بھی ان سے اظہارِ براءت کریں گے۔ جو آنکھیں بند کر کے "جی حضور" کا فریضہ ادا کرتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی بجائے ان کے فیصلوں اور حکموں کی تعمیل کرتے رہے، اور ان کی فرمانبرداری کو اپنی کمزوری سمجھتے رہے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَيْنٰكُمْ سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِيْصٍ﴾ (ابراہیم:۲۱)

"اور جب اللہ کے سامنے سب بے نقاب ہو جائیں گے تو اس وقت ان میں سے جو دنیا میں کمزور تھے وہ ان لوگوں سے جو بڑے بنے ہوئے تھے، کہیں گے ہم تمھارے تابع تھے اب کیا تم اللہ کے کچھ عذاب سے بچا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے اگر اللہ نے ہمیں ہدایت بخشی ہوتی تو ہم بھی تم کو ہدایت کی راہ بتلاتے، اب تو معاملہ یکساں ہے، خواہ ہم جزع فزع کریں یا صبر کریں ہمارے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔"

یہ نزاع اور تو تکار محاسبہ کے وقت ہی نہیں جہنم میں بھی ہوگی، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ﴾ (الاعراف:۳۸)

"جب ایک جماعت جہنم میں داخل ہوگی تو اپنی پیش رو کو لعنت کرتی ہوئی داخل ہوگی، حتی کہ جب سب وہاں جمع ہو جائیں گے تو ہر بعد والا گروہ پہلے گروہ کے بارے میں کہے گا اے ہمارے رب! یہ لوگ تھے جنھوں نے ہمیں

گمراہ کیا، لہٰذا انھیں آگ کا دوہرا عذاب دے، جواب میں کہا جائے گا ہر ایک کے لیے دوہرا ہی عذاب ہے مگر تم جانتے نہیں ہو۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا﴾

(الاحزاب:٦٦، ٦٧، ٦٨)

''جس روز (کباب کی طرح) ان کے چہرے آگ میں پلٹے جائیں گے تو وہ کہیں گے ہائے کاش! ہم اللہ کی اور رسول کی اطاعت کرتے، اور وہ کہیں گے اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سادات کی اور بڑوں کی اطاعت کی، تو انھوں نے ہمیں سیدھی راہ سے گمراہ کر دیا، اے ہمارے رب! انھیں دوہرا عذاب دیں اور ان پر بڑی لعنت و پھٹکار کریں۔''

یہ سب دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے وہ کریں گے اور جو ایک دوسرے سے یہاں ہمدردیوں کا یقین دلاتے ہیں وہ سب دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ یہ تو مجرموں کی باہمی ایک دوسرے سے بیزاری اور براءت کا اظہار ہے، قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے علاوہ جنھوں نے فرشتوں، انبیاء اور صلحاء کی پرستش کی اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے کہ تم نے گمراہ کیا اور انھیں شرک کی پگڈنڈیوں میں الجھایا؟ تو وہ بھی ان سے اظہار براءت کریں گے، ملاحظہ ہو: (المائدۃ:١١٦، سبا:٤٠، ٤١)

اللہ تعالیٰ ان جھگڑنے والوں سے رسوا کن انداز میں فرمائیں گے: ''اب میرے پاس تمھارا جھگڑا فضول ہے، یہاں مت جھگڑو، یہ تمھاری آپس کی الزام تراشی تمھیں عذاب سے بچا نہیں سکتی، میں نے اپنی نافرمانی کی وعید سے تمھیں خبردار کر دیا تھا اس لیے یہاں اب کسی عذر کی گنجائش نہیں، میں نے روزِ اول ہی یہ کہہ دیا تھا کہ جو شیطان مردود کے پیچھے چلے گا میں اسے شیطان سمیت جہنم رسید کردوں گا۔'' (الاعراف:١٨) ''اور جو میری

فرمانبرداری کرے گا میرے انبیاء اور میری آیات کی پیروی کرے گا وہ کوئی خوف وخطرہ محسوس نہیں کرے گا۔'' (الاعراف: ۳۵) ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

''اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی ڈر ہوگا نہ غم، جو ایمان لائے اور پرہیز گار رہے ان کے لیے دنیا میں خوشی ہے اور آخرت میں بھی، اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں، یہی بڑی کامیابی ہے۔'' (یونس: ۶۲، ۶۳، ۶۴)

میرا یہ فیصلہ سنا اور پہنچا دیا گیا ہے۔ میری باتیں سچی ہوتی ہیں وہ بدلی نہیں جاتیں۔ ہر ایک کو وہی کچھ ملے گا جس کا وہ مستحق ہے۔ میں اپنے بندوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا، گناہ اور نافرمانی کے نتیجے میں سزا، ظلم نہیں انصاف کے عین مطابق ہے، نہ میں کسی بندے کا گناہ کے بغیر مؤاخذہ کرتا ہوں اور نہ ہی اس کے اچھے اعمال کے بدلے میں کسی قسم کی کمی کرتا ہوں، ظلم تو یہ ہے برے انجام سے خبردار کیے بغیر مؤاخذہ کیا جائے، جب میں نے پہلے سے تنبیہ کر دی تو اب اس کے مطابق مؤاخذہ ظلم نہیں ہے۔

یہاں ''ظلام'' مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد مبالغۂ ظلم کی نفی نہیں، بلکہ نفسِ ظلم کی نفی ہے، جیسا کہ دوسرے مقامات پر آیا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا﴾ (یونس: ۴۴) ''کہ اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتے۔'' یا جیسے فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ (النساء: ۴۰) ''اللہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتے۔'' جس کا جتنا قصور ہے اسی نسبت سے اسے سزا ملے گی۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا﴾ (طٰہٰ: ۱۱۲) ''کہ جو مومن نیک عمل کرے گا اسے نہ ظلم کا ڈر ہوگا اور نہ ہی حق تلفی کا۔'' ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ﴾ (یٰس: ۵۴) ''آج کے دن کسی پر ظلم نہیں ہوگا، سب کو ویسا ہی بدلہ ملے گا جیسا دنیا میں کرتے رہے۔'' حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت صحیح مسلم میں ہے جس کے ابتدائی الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا عِبَادِيْ إِنِّيْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰى نَفْسِيْ وَجَعَلْتُهُ بَيْنَكُمْ

مُحَرَّمًا فَلَا تَظَالَمُوْا. (مسلم:۲۵۷۲)

''اے میرے بندو! میں نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کیا ہے۔ اور تمھارے مابین بھی حرام قرار دیا ہے، لہٰذا ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔''

جب اللہ تبارک و تعالیٰ قادرِ مطلق ہونے کے باوجود ظلم نہیں کرتے تو انسان کو بھی چاہیے کہ وہ اس سے باز رہے۔ ''ظلم'' اللہ کی شانِ رحمت ورأفت، عدل وانصاف اور حکمت کے منافی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی فعل کو ظلم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قیامت کا دن تو ''یوم الدین'' انصاف کا دن ہے، وہاں ظلم کیسا؟ اللہ تعالیٰ نہ ہی دنیا میں کسی پر ظلم کرتے ہیں نہ ہی آخرت میں کریں گے، اس کا ہر فیصلہ عدل وانصاف پر مبنی ہے، مگر اس کے فیصلے کی حکمت وہی جانتا ہے۔ یاد رہے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے کہ نیک جنت میں اور بد جہنم میں جائے گا، مگر ان میں سے کوئی چیز اللہ تعالیٰ پر لازم اور واجب نہیں ہے۔ جیسا کہ بدعتی فرقہ معتزلہ کا عقیدہ ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ ﴿يَغْفِرُ لِمَن يَشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَآءُ﴾ (البقرۃ:۲۸۴) ''جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب میں مبتلا کر دے۔'' حضرت شیخ عبد القادر رحمہ اللہ اپنے مواعظ ''الفتح الربانی'' کی مجلس نمبر ۶۱ میں فرماتے ہیں:

''جنت کا عمل طاعت ہی ہے اور دوزخ کا عمل معصیت ہے۔ اس کے باوجود اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے اگر چاہے تو عمل کے بغیر ہی کسی کو ثواب دیدے، اور چاہے تو بُرے عمل کے بغیر کسی کو عذاب دیدے، یہ سارے فیصلے اس کے اختیار میں ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں۔ باقی سب سے باز پرس ہوگی۔ اگر وہ انبیاء اور صالحین میں سے کسی کو دوزخ میں ڈال دے تب بھی وہ عادل ہے اور یہ حجت بالغہ ہوگی، ہمارے لیے لازم ہے کہ کہیں: حاکم بہر نوع سچا ہے ہم کوئی چون وچرا نہیں کر سکتے، ایسا ہونا ممکن ہے اگر ایسا ہو تو یہ انصاف اور حق ہوگا، البتہ یہ ایسی بات ہے کہ وقوع میں نہیں آئے گی اور وہ ایسا کرے گا نہیں۔''

کیونکہ وہ وعدہ خلاف نہیں، بلکہ سنن ابی داود کتاب السنۃ ،باب فی القدر، حاکم اور ابن ماجہ میں عبداللہ بن فیروز ابن الدیلمی رضی اللہ عنہ سے ہے کہ میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے تقدیر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا:

لَوْ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى عَذَّبَ أَهْلَ سَمٰوَاتِهٖ وَأَهْلَ أَرْضِهٖ عَذَّبَهُمْ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ لَهُمْ، وَلَوْ رَحِمَهُمْ كَانَتْ رَحْمَتُهٗ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْ أَعْمَالِهِمْ. الخ (ابوداود مع العون: ص۳۶۱ ج۴)

''کہ اگر اللہ تعالیٰ تمام زمین اور آسمان میں بسنے والوں کو عذاب دے تو وہ ظالم نہیں اور اگر ان پر رحم فرمائے تو رحمت ان کے لیے ان کے اعمال سے بہتر ہوگی۔''

یعنی یہ رحمت ان کے اعمال کے بسبب نہیں، عملِ صالح تو بجائے خود اس کی رحمت ہے۔ عبداللہ بن فیروز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گیا، تو انھوں نے بھی اسی طرح فرمایا، پھر میں حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں گیا تو انھوں نے بھی اسی طرح فرمایا، پھر میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ہاں گیا تو انھوں نے بھی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان سنایا۔ گویا یہ روایت مرفوع ہے۔ علامہ ابن رجب رحمہ اللہ نے جامع العلوم والحکم (ص۱۹۵ حدیث نمبر۲۴) کے تحت فرمایا ہے کہ اس روایت کی سند میں وہب بن خالد ہے جو مشہور بالعلم نہیں، مگر ان کا یہ قول درست نہیں۔ وہب بن خالد کو امام ابوداود، ابن حبان اور العجلی رحمہم اللہ نے ثقہ کہا ہے۔ (تہذیب: ص۱۶۲ ج۱۱) علامہ البانی رحمہ اللہ نے شرح عقیدہ طحاویہ (ص۴۵۰ رقم: الحدیث ۶۲۹) میں اس حدیث کو صحیح کہا ہے اور اس کی تخریج انھوں نے امام ابن ابی عاصم رحمہ اللہ کی کتاب السنۃ رقم (۲۴۵) میں تفصیلاً کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ساری مخلوق کا وہی مالک ہے وہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کر سکتا ہے۔ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے، کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں کیا؟ کوئی چیز اس پر لازم اور واجب نہیں، لیکن اس کا فیصلہ یہ ہے کہ میں نیک کو

جنت اور بد کو جہنم میں داخل کروں گا، اور اس کا فیصلہ بدلا نہیں جاتا۔ یوں اللہ کی صفتِ قدرت اور صدق دونوں قائم اور اپنے محل پر درست ہیں۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر ترجیحی طور پر رحمت وشفقت کو لازم کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا: ﴿كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام:١٢) ''اس نے اپنے آپ پر رحمت لازم کر لی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام:٥٤) ''سلام ہو تم پر تمھارے رب نے اپنے اوپر رحمت لکھ لی ہے۔'' اللہ تعالیٰ بلا ریب رحمان ورحیم ہیں، مگر کوئی اللہ تعالیٰ کو رحم وکرم پر مجبور نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ نے آپ ہی اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے کہ میں اپنے بندوں پر رحمت وشفقت کا معاملہ کروں گا۔ ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف:١٥٦) ''کہ میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے۔'' حاملینِ عرش اور اس کا طواف کرنے والے اللہ کی تسبیح کے ساتھ ساتھ ایمانداروں کے لیے بخشش کی دعا کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

﴿رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ﴾ (المؤمن:٧)

''اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرے علم نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے، جو لوگ توبہ کریں اور تیری بتلائی ہوئی راہ پر چلیں انھیں بخش دے اور انھیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

یہ اسی مہربان کی نوازش کہ جو علیم ہے، ہر ایک کے بارے میں پورا علم ہے، قادر ہے، کوئی اس کی دسترس سے باہر نہیں، پھر بھی وہ رحمت وشفقت ہی کا معاملہ فرماتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کہ جب اللہ نے ساری مخلوق کو پیدا فرمایا تو ایک کتاب میں جو عرش پر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے یہ لکھا کہ إِنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي ''کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے۔'''' (بخاری، کتاب التوحید، رقم ٧٤٢٢، مسلم) اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کے بارے میں بہت سی احادیث وآثار مروی ہیں، ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام تر قدرت کے باوجود کسی پر

ذرہ برابر ظلم نہیں کرتے، بلکہ بہر آئینہ اپنے بندوں پر رحمت و شفقت فرماتے ہیں، اپنا پہلا تعارف اپنے ذاتی نام کے بعد ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ سے کروایا، جس کی رحمانیت و رحیمیت کے بغیر نہ دنیا میں کوئی چارہ ہے نہ ہی آخرت میں۔ (وللتفصیل موضع آخر)

یہاں بظاہر ایک اشکال ہے کہ اس آیت میں تو فرمایا گیا ہے کہ "میرے سامنے مت جھگڑو" جبکہ سورۃ الزمر (۳۱) میں ہے: ﴿ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ﴾ "پھر تم قیامت کے روز اپنے رب کے ہاں جھگڑو گے۔" علمائے مفسرین نے فرمایا ہے: جھگڑے کی نفی دوسرے کو عذاب میں پھنسانے اور اپنے آپ کو عذاب سے بچانے اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے حوالے سے ہے، جبکہ جھگڑا باہمی معاملات اور مظالم کے حوالے سے ہے اس لیے کوئی اشکال نہیں۔

﴿يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ (۳۰)

''وہ دن جب ہم جہنم سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور کچھ ہے۔''

یہ جہنمیوں کے بارے میں اللہ میں کے غضب کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو اپنی شانِ بے نیازی سے جہنم میں پھینک دے گا اور پھر اس سے پوچھے گا تیرا پیٹ بھرا ہے یا نہیں؟ جہنم سے اس کے بھرے جانے کا سوال اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: ﴿لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ﴾ الآیہ (ھود:۱۱۹، السجدۃ:۱۳) ''کہ میں شیطان اور اس کے متبعین سے جہنم کو بھروں گا۔'' اسی فیصلے کی بنا پر اللہ جہنم سے پوچھے گا کیا تو بھر گئی ہے؟ تو وہ جواب دے گی کیا اور کچھ ہے، اس میں جہنم کے غصے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بڑے غیظ و غضب سے کہے گی: ابھی اور ہیں تو لایئے آج کوئی مجرم چھوٹنے نہ پائے، مجھ میں ابھی بڑی گنجائش ہے۔ صحیح بخاری میں اسی آیت کی تفسیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جہنم میں مجرموں کو پھینکا جائے گا اور وہ کہتی جائے گی ابھی کیا اور کچھ ہے۔ تا آنکہ اللہ رب العزت اس میں اپنا قدم رکھیں گے تو وہ سمٹ جائے گی اور پکار اٹھے گی: بس بس!

(بخاری: رقم ۴۸۴۸، ۶۶۶۱، ۷۳۸۴ و صحیح مسلم: ۷۱۷۷)

یہی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ (صحیح بخاری: رقم ۴۸۴۹، ۴۸۵۰، ۷۴۴۹ وغیرہ) حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ تفصیل بھی ہے کہ جنت اور دوزخ باہم آپس میں تکرار کرنے لگیں، دوزخ نے کہا: مجھ میں وہ لوگ ہوں گے جو بڑے مغرور و سرکش ہیں، جنت نے کہا: معلوم نہیں کیا وجہ مجھ میں وہ لوگ آئیں گے جو مسکین غریب اور نظروں سے گرے ہوئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جنت سے فرمایا: تو میری

 جہنم سے

فرمایا: تو میرا غضب ہے میں تیرے ذریعے سے اپنے جن بندوں کو چاہوں گا عذاب دوں گا، میں تم دونوں کو بھروں گا، دوزخ تو کسی طرح نہ بھرے گی تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا پاؤں رکھے گا، تب وہ کہے گی: بس بس، اور پھر وہ سمٹ جائے گی اور اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ظلم نہیں کرے گا۔ اور رہی جنت تو اس کو بھرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا کرے گا۔ یہی روایت صحیح مسلم (رقم: ۷۱۷۶) اور مسند امام احمد میں حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے۔ اور حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس کا تذکرہ اپنی تفسیر میں کیا ہے۔

یہاں ایک بات غور طلب ہے۔ پہلی تو یہ کہ ان روایات میں ”حَتّٰی یَضَعَ قَدَمَهٗ“ ”فَیَضَعُ الرَّبُّ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی قَدَمَهٗ“. ”حَتّٰی یَضَعَ رِجْلَهٗ“. حَتّٰی یَضَعَ فِیْهَا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ قَدَمَهٗ“ کے الفاظ ہیں کہ اس میں یا اس پر اللہ تعالیٰ اپنا قدم رکھیں گے۔ اس کا کیا مفہوم ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سلف، یعنی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا اس مسئلہ میں اور اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات مثلاً وجہ، ید، سمع، بصر، کلام، نزول، علو، استویٰ وغیرہ میں موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ صفات اسی طرح بلا تأویل و تفسیر تسلیم کرنی چاہییں، مگر بہت سے علماء نے جیسے دوسری صفات کے بارے میں تأویل کی، وہ یہاں بھی اس حدیث کی تأویل کرتے ہیں اور اس تأویل میں ان کی آرا نہایت مختلف ہیں۔ حتی کہ بعض نے تو سرے سے حَتّٰی یَضَعَ الرِّجْلَ کے الفاظ کا انکار ہی کر دیا، تا کہ نہ رہے سر نہ ہو درد سر۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ قول مردود ہے کیونکہ صحیحین میں یہ الفاظ ثابت ہیں۔ (فتح الباری: ص ۵۹۶ ج ۸) صحیح بات یہی ہے کہ دیگر صفاتِ الٰہیہ کی طرح یہاں بھی ائمۂ سلف کی طرح تأویل کی بجائے صفت ''قدم'' یا ''رجل'' کو علی حالہ تسلیم کیا جائے۔ اور اللہ کے جو شایانِ شان ہے اس کے مطابق اسے بھی مانا جائے۔

امام ماتریدی رحمہ اللہ نے تفسیر میں اس حدیث کے ظاہری مفہوم پر ایک اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو جہنم کو سرکشوں سے بھرنے کا فرمایا ہے، جبکہ اس حدیث میں ''قدم'' یا ''رجل'' کے ذریعے سے بھرنے کا تأثر نکلتا ہے۔ لیکن یہ اعتراض درست نہیں، کیونکہ حدیث میں ہے کہ قدم رکھنے سے جہنم سمٹ جائے گی اور پکار اٹھے گی: بس، بس! گویا قدم

سے اس کی وسعت ہی کم پڑ جائے اور وہ سکڑ جائے گی۔ اور یوں سکڑ کر وہ بھر جائے گی۔ اس لیے یہ اعتراض درست نہیں۔

یہاں یہ بھی پیشِ نگاہ رہے کہ بخاری شریف (رقم: ۴۸۵۰) میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جیسا کہ اوپر گزرا ہے کہ جنت کو بھرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا کرے گا۔ لیکن بخاری شریف ہی میں ہے کہ جہنم نہیں بھرے گی تا آنکہ اللہ تعالیٰ اور مخلوق پیدا کرے گا اور اسے جہنم میں ڈالے گا اور وہ کہے گی کیا اور بھی ہیں؟ پھر اللہ تعالیٰ اس میں اپنا قدم رکھے گا۔ (بخاری: کتاب التوحید، رقم ۷۴۴۹) حالانکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے مطابق نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے پر ظلم نہیں کرتے تو اس وقت مخلوق کو پیدا کرکے بلا جرم جہنم میں ڈال دینا کیونکر ممکن ہے؟ اللہ تعالیٰ اگر بلا جرم سزا دیں تو وہ اس پر قادر ہیں، ایسا کرنے سے بھی کوئی اس سے سوال نہیں کرسکتا۔ لیکن یہ صرف جواز اور امکان کے درجہ میں ہے اہلِ سنت اس کے وقوع کے قائل نہیں جیسا کہ پہلے ہم ذکر کرآئے ہیں۔ اسی لیے بعض حضرات نے اس کی مختلف تاویلات کی ہیں۔ مگر حافظ ابن قیم رحمہ اللہ اور دیگر حضرات نے فرمایا ہے کہ اس روایت میں قلب ہوگیا ہے اور اصول حدیث کی اصطلاح میں یہ روایت مقلوب ہے۔ اصل روایت میں تو جنت کے لیے نئی مخلوق پیدا کرکے اسے جنت میں داخل کرنے کا ذکر ہے، مگر راوی کی غلطی سے اس کا ذکر جہنم کے بارے میں ہوگیا۔ تفصیل کے لیے فتح الباری (ص ۴۳۷ ج ۱۳) ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ روایت ''بَابُ إِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ'' میں ذکر کی ہے۔ اور حدیث میں فَقَالَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ لِلْجَنَّةِ، أَنْتِ رَحْمَتِي ''کہ اللہ تعالیٰ جنت سے فرمائے گا تو میری رحمت ہے'' سے اللہ کی رحمت پر استدلال ہے۔ اور حدیث کا قابلِ اعتراض جملہ امام صاحب کی غرض ومقصود کے منافی ہے۔ انھوں نے یہ جیسے شیوخ سے سنا بیان کردیا۔ اس سے ان کا کوئی استدلال ہوتا تو تفسیر میں ''بَابُ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ'' میں لاتے۔

اہلِ علم جانتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا اسلوب ہے کہ اگر روایت میں کوئی جملہ

محلِ نظر ہوتو وہ اسے اپنے مقصود باب میں نہیں لاتے ، اور نہ ہی اس سے ان کا استدلال ہوتا ہے، اور اس قسم کے جملوں سے امام بخاری رحمہ اللہ پر اعتراض بجائے خود ان کے اسلوب کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

یہاں حدیث ہی کی موافقت سے یہ بات بھی یادر ہے کہ جنت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ میری رحمت ہے ،گویا اللہ کی رحمت کا مظہر جنت اور اس کے انعامات ہیں۔ بعض حضرات جو فرماتے ہیں: کہ اللہ سے جنت طلب نہیں کرنی چاہیے یہ طلب تو پھر مخلوق کی طلب ہے، خالق سے خود خالق کی محبت طلب کرنی چاہیے، مگر ان کا یہ خیال درست نہیں جنت کی طلب اس لیے کہ وہ محلِ دیدارِ محبوب ہے اور اللہ کی رحمت کا مظہر ہے، اور دوزخ اس کی ضد ہے اور اللہ کے غضب کا مظہر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے جنت الفردوس کا سوال کرتے اور دوزخ سے پناہ طلب کرتے تھے اور یہی تعلیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دی اور اللہ تعالیٰ سے جنت طلب کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت مبارکہ میں ﴿هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ﴾ کہ کیا اور کچھ ہے، کو استفہامِ انکاری کے مفہوم میں لیا ہے کہ کیا مجھ میں کوئی گنجائش باقی رہی ہے کہ مجھ میں اور زیادتی کی جائے ، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ سے منقول ہے۔ مگر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ ان حضرات کا یہ موقف تب درست ہے جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنا قدم اس میں رکھ لیں گے اور وہ بس بس پکارے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ تاویل اللہ تعالیٰ کے قدم رکھنے سے پہلے قرار دی جائے تو یہ جہنم کی وسعت ،اس کے جوش وغضب ،جس کا ذکر قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں آیا ہے، کے منافی معلوم ہوتی ہے۔

اس آیت میں جہنم کی وسعت کا بیان ہے یا اس کے بھر جانے کا بیان ہے، دونوں صورتیں جہنمیوں کی غمنا کی اور مزید فکر مندی کا باعث ہیں، پہلی صورت میں جہنمی یہ سن کر: کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کو بھرنے کا وعدہ کیا تھا اور آج اس سے پوچھا جا رہا ہے کہ تو بھری ہے یا نہیں، اور وہ جوشِ غضب سے کہہ رہی ہے کہ ابھی اور ہیں تو لاؤ، ابھی بڑی گنجائش ہے۔ کفار ومشرکین اور پریشان ہو جائیں گے کہ ابھی یہ بھری نہیں تو اس سے نکلنے کی امید کیسے ہو سکتی

ہے؟ اور اب جب اسے بھرنے کے لیے مزید مجرموں کو اس میں ٹھونسا جائے گا تو یہ مزید تنگی اور پریشانی میں اضافے کا باعث بنے گا۔

دوسری صورت میں جب جہنمی سنیں گے: کہ دوزخ کہہ رہی ہے: کہ میں بھر چکی، مجھ میں کوئی گنجائش نہیں، اور کیا ابھی باقی ہیں، تو تب بھی یہ ان کی مزید پریشانی کا باعث ہے کہ یہاں تو پہلے ہی ایک دوسرے پر لعن وطعن، چیخ وپکار اور مختلف اذیتوں میں پھنسے ہوئے ہیں اگر اور لاکر یہاں پھینک دیے گئے تو تنگی اور تکلیف اور بڑھ جائے گی۔ خلاصۂ کلام یہ کہ جہنم میں انواع واقسام کے عذاب اور تکالیف کو برداشت کرتے کرتے عذاب میں تخفیف کی اپیلوں اور موت کی تمناؤں اور التجاؤں میں اپنے آپ کو نامراد پائیں گے تو دوزخ کا یہ جواب مزید ان کی اذیت میں اضافہ کا باعث بنے گا۔ أعاذنا الله منه.

یہاں یہ جہنم اور جنت کو مخاطب کرنے کا جو ذکر آیا یہ محض تصوراتی نہیں کہ بس جہنم سے ڈرانا مقصود ہے اور نہ ہی مجازی ہے کہ جہنم وجنت تو کوئی ذی روح اور زندہ بولنے والا وجود نہیں کہ ان سے کلام ہو سکے۔ بلکہ یہ کلام اور مخاطبت حقیقی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس سے چاہے کلام کرے اور اسے بولنے سننے کی قوت وطاقت عطا فرما دے۔ اگر اللہ تعالیٰ زبان کے علاوہ انسانی اعضاء کو بولنے اور ان سے شہادت لینے پر قادر ہے، پہاڑوں سے، زمین وآسمان سے بلکہ اپنی ہر مخلوق سے کلام کرنے اور ان سے جواب طلب کرنے پر قادر ہے تو جنت ودوزخ سے یہ تخاطب بھی بالکل ممکن اور حقیقت پر مبنی ہے۔

قرآنِ مجید کی یہ آیت کریمہ فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے۔ علامہ طنطاوی رحمہ اللہ نے اس حوالے سے ایک بڑا دلچسپ واقعہ ذکر کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ۱۳ جون ۱۹۳۲ء کو میری ملاقات معروف مصری ادیب کامل گیلانی سے ہوئی، انھوں نے ایک عجیب واقعہ بیان فرمایا کہ میرے امریکی مستشرق پروفیسر فنکل کے ساتھ گہرے علمی وادبی تعلقات تھے، ایک روز میں ان کے ساتھ تھا، تو انھوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا: ''کیا دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی قرآن کو معجزہ تسلیم کرتے ہو؟'' یہ کہہ کر وہ معنی خیز ہنسی ہنسنے لگا۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ قرآنِ مجید کو معجزہ قرار دینے کی کوئی حقیقت نہیں، مسلمان محض تقلیداً اسے تسلیم کر

رہے ہیں۔ ان کا یہ حال دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا: قرآنِ مجید کی فصاحت وبلاغت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم تجربہ کر کے دیکھ لیں کہ کیا ہم اس جیسا کلام مرتب کر سکتے ہیں یا نہیں، تجربہ سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا کہ ہم ایسا کلام کرنے پر قادر ہیں یا نہیں۔ چنانچہ میں نے استاد فنکل سے کہا: آیئے ہم ایک قرآنی مفہوم کو عربی الفاظ میں مرتب کرتے ہیں۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ ''جہنم بہت وسیع ہے۔'' انھوں نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ ہم قلم کاغذ لیکر بیٹھ گئے اور ہم نے باہم مشورہ سے تقریباً بیس عربی جملوں میں اس مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی، وہ جملے یوں تھے۔

إن جهنم واسعة.

إن جهنم لأوسع مما تظنون.

إن سعة جهنم لا يتصورها عقل الإنسان.

إن جهنم لتسع الدنيا كلها.

إن الجن والإنس إذا دخلوا جهنم لتسعهم ولا تضيق بهم.

كل وصف في سعة جهنم لا يصل إلى تقريب شيء من حقيقتها.

إن سعة جهنم لتصغر أمامها السماوات والأرض.

كل ما خطر ببالك في سعة جهنم فإنها لأرحب منه وأوسع .

سترون من سعة جهنم مالم تكونوا لتعلموابه أوتتصوروه.

مهما حاولت أن تتخيل سعة جهنم فأنت مقصر ولن تصل إلى شيء حقيقتها.

إن البلاغة المعجزة لتقصر وتعجز أشد العجزعن وصف سعة جهنم.

إن سعة جهنم قد تخطت أحلام الحالمين وتصور المتصورين.

متى أمسكت بالقلم وتصديت لوصف سعة جهنم أحسست بقصورك وعجزك.

إن سعة جهنم لايصفها وصف ولا يتخيلها وهم ولا تدوربحسبان.

كل وصف لسعة جهنم إنما هو فضول وهذيان

جب ہم دونوں نے اپنی کوشش مکمل کر لی اور ہمارے پاس مزید الفاظ اور جملے نہ رہے تو میں نے استاد فنکل کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا: جب ہم اپنی تمام تر کوشش اس مفہوم کو ادا کرنے میں صرف کر چکے ہیں تو اس سے آپ پر قرآن کی فصاحت وبلاغت کھل جائے گی۔ پروفیسر فنکل نے کہا: کیا قرآن نے اس مفہوم کو زیادہ فصاحت سے ادا کیا ہے؟ تو میں نے کہا: بالکل، بلکہ ہم تو قرآنِ مجید کے مقابلے میں بچے ثابت ہوئے ہیں۔ انھوں نے حیرت سے پوچھا کہ قرآن میں کیا ہے؟ میں نے سورۂ ق کی یہی آیت پڑھی: ﴿يَوْمَ نَقُولُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُولُ هَلْ مِنْ مَّزِيدٍ﴾ تو وہ یہ سن کر حیران وششدر ہو کر رہ گئے انھوں نے کہا آپ نے بالکل صحیح کہا میں کھلے دل سے اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے کہا: یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ نے حق کو تسلیم کر لیا ہے کیونکہ آپ ادیب ہیں اور اسلوبِ کلام سے خوب واقف ہیں۔ یہ مستشرق انگریزی، جرمن، عبرانی اور عربی زبانوں پر دسترس رکھتا تھا اور ان زبانوں میں کتابوں کے مطالعہ میں اپنی عمر صرف کر دی تھی۔"

(الجواہر فی تفسیر القرآن: جز ۲۳، ص ۱۱۱، ۱۱۲، مطبوعہ ۱۳۵۱ھ)

﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ (۳۱)

''اور جنت متقیوں کے قریب لائی جائے گی، کچھ بھی دور نہ ہوگی۔''

أُزْلِـفَـتْ ''الزلفة'' سے ہے جس کے معنی ہیں: قرب، نزدیکی۔ مشرکین کہتے تھے۔ ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ ''ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیتے ہیں۔''

جہنم اور جہنمیوں کے مقابلے میں اب جنت اور جنتیوں کا ذکر ہے، جہنم میں تو مجرموں کو گھسیٹ کر، بعض کو سر کے بل کھینچ کر، بڑی بڑی ہتھ کڑیوں میں جکڑ کر، ذلت آمیز صورت میں پھینکا جائے گا۔ مگر اہلِ جنت کے بارے میں جوں ہی فیصلہ سنا دیا جائے گا، تو وہ چل چل کر منزلِ مراد کو نہیں، بلکہ اسے بالکل اپنے سامنے پائیں گے۔ اہلِ جنت کو نہیں، بلکہ خود جنت کو لا کر ان کے قریب کر دیا جائے گا اور انھیں کوئی مسافت طے نہیں کرنی پڑے گی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ جنتی کی کس قدر تکریم و تعظیم ہے کہ اسے جنت کے قریب نہیں، بلکہ خود جنت کو اس کے قریب کر دیا جائے گا، گویا جنت کو پیش کش کی طرح خود جنتی کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغَاوِيْنَ﴾

(الشعراء: ۹۰، ۹۱)

''کہ جنت متقیوں کے قریب کی جائے گی اور جہنم گمراہوں کے لیے ظاہر کر دی جائے گی۔''

تا کہ یہ دیکھ لیں کہ یہ ہے ہمارا ٹھکانا۔ جہنم کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿إِذَا رَأَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا﴾

(الفرقان: ۱۲)

”کہ جب جہنم انہیں دور سے دیکھے گی تو وہ اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے۔“

مگر جہنمیوں کے مقابلے میں اہلِ جنت کے لیے جنت قریب تر کر دی جائے گی، اور ﴿غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ یہ ﴿وَأُزْلِفَتْ﴾ کا مزید بیان ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ جنت کوئی بہت دور سے قریب نہیں لائی جائے گی کہ جس کے انتظار میں ابھی اور وقت درکار ہو، بلکہ وہ بالکل قریب ہے اور اہلِ جنت کے لیے مزید قریب کر دی جائے گی۔ گویا انتظار کی گھڑیاں ختم، ادھر پل صراط سے اترے، ادھر جنت میں پہنچ گئے۔ مگر بعض نے کہا ہے ﴿غَيْرَ بَعِيْدٍ﴾ سے مراد قیامت ہے جو دور نہیں لامحالہ واقع ہونے والی ہے اور جس کا آنا یقینی ہو، اسے دور نہیں سمجھا جاتا، مگر یہ تاویل سیاقِ کلام کے موافق نہیں ہے۔

﴿هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ أَوَّابٍ حَفِيْظٍ﴾ (۳۲)

''یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہر رجوع کرنے والے، حفاظت کرنے والے کے لیے۔''

جنت اہلِ جنت کے قریب لا کر پیش کش کے انداز میں، ان سے کہا جائے گا اس میں داخل ہو جاؤ، یہ ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اہلِ دوزخ کے بارے میں تو فرمایا گیا ہے: ﴿اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ﴾ ان کو جہنم میں پھینک دو۔ ان کے بارے میں تو فرمایا گیا: ﴿يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ﴾ (القمر: ۴۸) ''جس دن منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں پھینکے جائیں گے۔'' نیز فرمایا: ﴿يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا﴾ ''جس دن دھکے دے کر جہنم کی آگ میں گرائے جائیں گے۔'' جن کے بارے میں فرمایا جائے گا: اسے پکڑو اور گلے میں طوق ڈالو اور جہنم میں پھینک دو، ستر گز لمبی زنجیروں میں جکڑ کر اسے کھینچو۔'' جہنم کی ہولناک سزا میں جانے گا کون؟ انھیں تو گھسیٹ کر اور قیدی بنا کر ہی جہنم میں ڈالا جائے گا۔ مگر جنت کو اہلِ جنت کے قریب کر کے کہا جائے گا کہ اس میں داخل ہو جاؤ، جنت کا پروانہ ملنے کے بعد بے تابی بڑھے گی تو فرمایا جائے گا یہ ہے جنت! اس میں داخل ہو جاؤ، یہ ہے جس کا انبیاء ورسل کے ذریعے سے تمھارے ساتھ وعدہ کیا گیا تھا۔

جس طرح پہلے جہنمیوں کی چھ بد خصلتوں کا ذکر کیا، اب یہاں متقین اہلِ جنت کی چار صفاتِ حسنہ کا بیان ہے، جن کی بنا پر انھیں پروانۂ جنت ملے گا۔ چنانچہ ان کا پہلا وصف ''اواب'' یعنی بہت رجوع کرنے والا، بیان ہوا ہے۔ یہ لفظ ''اوب'' سے ہے جس کے معنی لوٹنا، رجوع کرنا ہیں۔ جو حیوان اور غیر حیوان کے لیے عام ہے، مگر یہ لفظ خاص کر حیوان کے ارادتاً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ اسی سے ''اواب'' مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جو معاصی کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، شعبی رحمہ اللہ اور

مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اواب'' وہ ہے جو تنہائیوں میں گناہوں کو یاد کر کے ان پر توبہ واستغفار کرے۔ عبید بن عمیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''اواب'' وہ ہے جو اپنی ہر مجلس میں اللہ سے بخشش طلب کرے۔ گویا ''اواب'' نفس کا بندہ نہیں بنتا، بلکہ اپنے اللہ کا بندہ بنتا ہے۔ وہ تمام خواہشاتِ نفس کو چھوڑ کر اللہ کی رضا جوئی میں رہتا ہے، اور جب کبھی اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو فی الفور توبہ واستغفار کے ذریعے سے اپنے اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے، اللہ جل جلالہ نے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام میں حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: کہ ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (ص:۴۴) ''وہ بہترین بندے رجوع کرنے والے تھے۔'' اسی طرح حضرت داود علیہ السلام کے بارے میں بھی یہی وصف آیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (ص:۱۷) حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے ﴿وَوَهَبْنَا لِدَاوُدَ سُلَيْمَانَ نِعْمَ الْعَبْدُ إِنَّهُ أَوَّابٌ﴾ (ص:۳۰) پانچ وقت کی نمازوں میں باجماعت حاضری بھی ''اواب'' ہونے کی علامت ہے کہ وہ شب وروز پانچ بار اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُحَافِظُ عَلٰى صَلَاةِ الضُّحٰى إِلَّا أَوَّابٌ قَالَ: وَهِيَ صَلَاةُ الْأَوَّابِيْنَ. (ابن خزیمہ: ص ۲۲۸ ج ۲، الحاکم: ص ۳۱۴ ج ۱، الصحیحہ: ۱۹۹۴)

''صلاۃ الضحیٰ کی محافظت ''اواب'' ہی کرتا ہے۔ اور اس نماز کے بارے میں آپ نے فرمایا: یہ صلاۃ الاوابین ہے۔''

سورج نکلنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے اسے صلاۃ الضحیٰ کہتے ہیں، البتہ اگر وہ سورج طلوع ہونے کے جلد بعد پڑھی جائے تو اسے صلاۃِ اشراق کہتے ہیں اور اگر سورج بلند ہونے پر پڑھی جائے تو اسے صلاۃ الضحیٰ یا صلاۃ الاوابین کہتے ہیں۔ یہ وقت بھی چونکہ غفلت اور کام کاج کا ہوتا ہے اس لیے اس میں اللہ کی طرف رجوع کو صلاۃ الاوابین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

دوسرا وصف ''حفیظ'' ہے، جو بمعنی ''حافظ'' ہے یعنی حفاظت کرنے والا۔ مراد وہ

شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کے تمام اوامر ونواہی کی حفاظت کرنے اور تمام حقوق وفرائض کو ادا کرنے والا ہو۔ بعض نے کہا: حفیظ وہ جو نواہی سے محفوظ رہنے والا اور ''اواب'' وہ جو اوامر کی پابندی کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے، بعض نے فرمایا کہ ''اواب'' کا تعلق دل سے ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف بار بار رجوع کرنے والا ہے۔ اور ''حفیظ'' کا تعلق عمل وکردار سے ہے، اور دل وعمل کی درستی ہی دین کا اصل مقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی مقامات پر اپنے بندوں کی اس صفت کا ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ اپنے اللہ سے جنت خریدنے والے مؤمنوں کے اوصاف میں فرمایا:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (التوبہ:۱۱۲)

''توبہ کرنے والے، عبادت گزار، اللہ کی تعریف کے گن گانے والے، روزے دار، رکوع، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنے والے، اور اے نبی ﷺ! ان مؤمنوں کو بشارت دے دو۔''

سورۃ الأحزاب (۳۵) میں بھی جن اوصاف کا تذکرہ ہوا ہے ان میں ایک یہ ہے: ﴿وَالْحَافِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ﴾ ''کہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور عورتیں''۔ سورۃ المؤمنون میں فلاح وفوز سے ہمکنار ہونے والے ایمانداروں کے اوصاف میں بھی ایک وصف یہ بیان ہوا ہے کہ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾ (المؤمنون:۹) ''وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں'' اس لیے حفیظ وحافظ کا دائرہ تمام اوامر ونواہی پر محیط ہے۔ ''اواب'' میں اللہ کی طرف بہر نوع رجوع مراد ہے اور ''حفیظ'' میں اس تعلق کی محافظت کا اشارہ ہے کہ یہ پختہ ومستحکم رہے ٹوٹنے نہ پائے۔

﴿مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ﴾ (۳۳)

''جو بغیر دیکھے رحمان سے ڈرا اور حاضر ہوا متوجہ رہنے والے دل سے۔''

جنت میں جانے والوں کا یہ تیسرا وصف ان جہنمیوں کے برعکس ہے، جو قیامت کے بارے میں شک وریب کا شکار رہے اور اللہ سے بے خوف زندگی گزاری۔ مگر ایک مؤمنِ صادق، اللہ تعالیٰ کو بن دیکھے اور قیامت پر یقین رکھتے ہوئے، اللہ سے ڈرتا رہا، اور وفا شعار زندگی گزاری، بلکہ مؤمن ومتقی کا تو بنیادی اور پہلا وصف ہی یہ ہے کہ وہ ﴿يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرۃ:۳) غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہوں، فرشتے ہوں، اللہ کے انبیاء اور اللہ کی کتابیں ہوں، قیامت ہو، جنت ودوزخ ہو، عذابِ قبر ہو، تقدیر کا مسئلہ ہو ہر ایک پر اصلاً ایمان بالغیب ہے، ایک کافر کا تو قیامت پر یقین نہیں اس کی آنکھیں تب کھلیں گی جب آنکھوں سے قیامت کو دیکھ لے گا۔ (قٓ:۲۲) اسے ''علمِ یقین'' تب حاصل ہوگا جب وہ آنکھ سے جہنم کو دیکھ لے گا۔ (التکاثر:۷) مگر مومن کو اس کا پہلے ہی یقین تھا اور اس سے ہمیشہ خوف کھاتا تھا۔ ''رحمٰن کو بن دیکھے ڈرنا'' یعنی نظر آنے والے انجام اور قوت وطاقت رکھنے والوں کے خوف سے زیادہ ''رحمٰن'' سے ڈرنا۔ یہاں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

۱۔ ''ڈر'' کے لیے لفظ ''خشي'' استعمال ہوا ہے، یہ اس خوف اور ڈر کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے طاری ہو جائے اور یہ کیفیت عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے، یہی وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ (فاطر:۲۸) ''اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحبِ علم ہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أَمَا وَاللّٰهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ. (بخاری:۵۰۶۳، مسلم) ''خبردار اللہ کی قسم! میں تم

سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سے زیادہ پرہیز گار ہوں۔'' آپ نے فرمایا:
لَوْ تَعلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا (بخاری:٦٤٨٥ وغیرہ)
جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جان لو تو تم کم ہنسو اور زیادہ روو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ (الحشر ٢١)

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو دیکھتے کہ وہ اللہ کے ڈر سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔''

پہاڑ کا یہ خوف اس کے ضعف اور کمزوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کا یہ خوف اللہ کی عظمت وکبریائی کے احساس سے ہے۔ اسی طرح فرشتوں کے بارے میں فرمایا: ﴿وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾ (الانبیاء:٢٨) ''اور وہ اس کے ڈر سے خوف کھاتے ہیں۔'' فرشتوں کا یہ ڈر بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کی بنا پر ہے ان کی کمزوری اور ضعف کے احساس سے نہیں۔

''ڈر'' کے لیے ایک لفظ ''خوف'' ہے۔ اس کا استعمال ایسے ڈر کے لیے ہوتا ہے جو کسی طاقت ور اور صاحبِ اختیار کے مقابلے میں اپنی ناتوانی اور کمزوری کے احساس میں پیدا ہوتا ہے، اور ''الخوف'' کے اصل معنی ہیں قرائن وشواہد سے کسی آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا، خوف کی ضد امن ہے۔ اور یہ دنیوی اور اخروی دونوں کے لیے ہے۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے مدارج السالکین جلد اول کے آخر میں خشیت، خوف، وجل، رھبہ کے فرق پر بڑی نفیس بحث کی ہے جو ہمارا موضوع نہیں۔ نیز اس کے لیے علامہ مجد الدین رحمہ اللہ فیروز آبادی کی بصائر ذوی التمییز بھی ملاحظہ فرمائیں۔ ہمارا مقصود یہ ہے کہ یہاں ''خوف'' کی بجائے ''خشی'' کا لفظ آیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اللہ کا ڈر مومن کے دل میں اللہ کی سرزنش، اس کے عذاب اور سزا کے خوف سے ہی نہیں، بلکہ اللہ کی عظمت وجلال کی ہیبت کی بنا پر طاری رہتا ہے۔ خشیت، خوف سے خاص اور خواص کا عمل

ہے۔خوف مقصود بالذات نہیں، بلکہ وسیلۂ عمل ہے اور جب مومن جنت میں چلا جائے گا تو ﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۱۲)ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ انھیں کوئی ملال ہوگا۔مگر اللہ کی عظمت کی ہیبت اور اس کے جلال کا احساس تو ہمیشہ رہے گا اور رہنا بھی چاہیے۔بھلائیوں اور نیکیوں میں سبقت لے جانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ ٥ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَا آتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلٰى رَبِّهِمْ رَاجِعُوْنَ ٥ أُولٰئِكَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ﴾ (المؤمنون:۵۷۔۶۱)

''وہ جو اپنے اللہ کی خشیت سے ڈرتے ہیں، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی دیتے ہیں ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے وہی نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور ان کے حصول میں سبقت کرتے ہیں۔''

جامع ترمذی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا اے اللہ کے رسول! اللہ کے فرمان کہ ''وہ جو کچھ بھی دیتے ہیں اور ان کے دل ڈرتے ہیں'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو چوری، زنا کرتے اور شراب پیتے ہیں اور وہ اللہ سے بھی ڈرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا:

لَا يَابِنْتَ الصِّدِّيْقِ، وَلٰكِنَّهُ الَّذِيْ يُصَلِّيْ وَيَصُوْمُ وَيَتَصَدَّقُ وَهُوَ يَخَافُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ.

(مسند احمد: ص۱۵۹،۲۰۵ ج۶، ترمذی رقم:۳۱۷۵)

''نہیں اے ابوبکر صدیق کی بیٹی! بلکہ وہ مراد ہے جو نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، صدقہ کرتا ہے اور اللہ جل جلالہ سے ڈرتا ہے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ﴾ (النور:۵۲)

”کامیابی وکامرانی پانے والے وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کریں، اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔“

سورۃ البینۃ میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ○ جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ○﴾ (البینۃ:۷،۸)

”جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے، وہی بہترین مخلوق ہیں، ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی جنتیں ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی، یہ سب کچھ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈر گیا۔“

سورۃ التوبۃ میں ہے:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ﴾

”اللہ کی مسجدیں وہ تعمیر کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے اور زکوۃ دیتے ہیں، اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتے، یہ ایسے لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔“

یہ اور اسی سے متعلق دیگر آیات سے اللہ کی خشیت کی ضرورت واہمیت واضح ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری بات جو اس آیت سے نمایاں ہوتی ہے وہ یہ کہ یہ ”خشیت“ رحمان سے ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ بڑا مہربان ہے، تب بھی اللہ سے ڈرتا ہے، اس کی رحمانیت ورحیمیت کی امید پر بے خوف اور گناہوں پر جری نہیں ہوتا۔ ایمان، خوف ورجا کے مابین ہے، صرف خوف تو اس کے ڈانڈے خارجیت اور رہبانیت سے جا ملتے ہیں اور محض رجا تو اس کے ڈانڈے مرجئہ سے جا ملتے ہیں۔ صراطِ مستقیم دونوں کے مابین ہے۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھیں بارگاہ عالیہ سے ”رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ“ کے اعزاز سے نوازا گیا، اور انھیں جنت کی بشارت دی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان پر اپنی رضا کا اظہار فرمایا، اور ان میں سے بعض کا نام لے لیکر جنت کی نوید سنائی۔ لیکن اس کے باوجود ان پر اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف کا عالم یہ تھا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ جنھیں دربارِ رسالت سے صدیق کا لقب ملا تھا، وہ روتے ہیں اور زبان کو پکڑ کر کھینچتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا تو کہا ٹھہریں اللہ تعالیٰ آپ کی بخشش فرمائے (یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟) انھوں نے فرمایا: اِنَّ ھٰذَا اَوْرَدَنِیَ الْمَوَارِدَ. اس نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ (موطا: ص ۷۳۸ وغیرہ) وہی ایک بار فرماتے ہیں: وددت انی شعرۃ فی جنب عبد مؤمن. ”مجھے تو یہ پسند ہے کہ میں بندۂ مومن کا ایک بال ہوتا۔ (الزھد لاحمد) کبھی فرماتے: کاش میں درخت یا سبزہ ہوتا اور جانور اسے کھا لیتے، اور کبھی فرماتے: اے پرندے تمھیں مبارک ہو، کاش میں تجھ جیسا ہوتا، تو درختوں پر بیٹھتا ہے، پھل کھاتا ہے اور اُڑ جاتا ہے، تیرا کوئی حساب کتاب نہیں۔ (ابن ابی شیبہ)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سورۃ الطور پڑھ رہے تھے۔ جب ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ﴾ پر پہنچے تو رونے لگے اتنا روئے کہ شدتِ خوف سے بیمار پڑ گئے اور ساتھی ان کی عیادت کے لیے جاتے۔ ایک دفعہ زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور فرمایا کیا اچھا ہوتا کہ میں یہ تنکا ہوتا! کاش میری ماں مجھے نہ جنتی۔ وفات کے وقت بیٹے عبداللہ سے فرمایا: میرا چہرا زمین سے لگا دو شاید اللہ مجھے معاف فرما دے اگر میری بخشش نہ ہوئی تو میری ماں کے لیے ویل ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا امیر المومنین آپ نے بہت سے شہر بسائے ہیں اور

آپ کی بدولت بہت سے علاقے مفتوح ہوئے ہیں، فرمایا: نہ ان خدمات کا صلہ ملے نہ ہی ان کے بارے میں باز پرس ہو، بس اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمادے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قبر پر کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ داڑھی تر ہو جاتی، حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ، جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس امت کا امین قرار دیا، فرمایا: کرتے کاش میں مینڈھا ہوتا میرے اہلِ خانہ مجھے ذبح کر کے میرا گوشت کھا لیتے اور میرا شوربا پی لیتے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے: کاش میں درخت ہوتا اور مجھے کاٹ دیا جاتا۔ امام احمد رحمہ اللہ کی کتاب الزہد وغیرہ میں یہ اور اسی نوعیت کے دیگر صحابۂ کرام کے بہت سے اقوال موجود ہیں۔ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے الداء والدواء (ص ۵۳، ۵۴) میں بھی ان اقوال کا ذکر کیا ہے۔ جس سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بشارتوں کے باوجود ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف، قیامت کے روز جواب دہی کا احساس کس قدر تھا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے دی ہوئی بشارتوں سے بس امید کے سہارے زندگی نہیں گزاری، بلکہ زہد وتقویٰ، علم وعمل، اخلاص وللّٰہیت کی ایسی مثالیں قائم کیں جو قیامت تک امت کے لیے مینارۂ نور ہیں، مگر اس کے باوصف ان کے دل اللہ کی خشیت اور خوف سے معمور تھے۔ یہی سلامتی کی راہ ہے اور یہی کامیابی کی کلید ہے۔ عمل واطاعت اور تقویٰ وتزکیہ کے بغیر جنت کی امید مؤمن کا شیوہ نہیں، بلکہ مغضوب وضالین کا طریقہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ فرمایا ہے کہ یہ سب ان کی خواہشات ہیں۔ (البقرہ:) دنیا کی کونسی چیز ہے جو محض تمناؤں اور آرزوؤں کے سہارے حاصل ہوتی ہے، دنیا مردود کی جب یہ حیثیت ہے تو جنت جیسی قیمتی اور محبوب جگہ خالی امیدوں سے کیونکر حاصل ہوگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فرمایا:

مَنْ خَافَ اَدْلَجَ وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ اِلَّا اَنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ الْجَنَّةُ. (ترمذی: ۲۴۵۰، الصحیحہ: ۹۵۴)

”جو ڈر گیا وہ رات کو چل نکلا، اور جو رات کو چلا اس نے منزل کو پا لیا، خبردار اللہ کا سامان بڑا مہنگا ہے، خبردار اللہ کا سامان جنت ہے۔“

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کی امید پر نہ بے عمل اور بے خوف ہونا چاہیے اور نہ ہی اس کی جباریت اور قہاریت سے ناامید ہونا چاہیے۔

۳۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو تنہائی میں اللہ سے ڈر گیا۔ حدیث میں جن خوش نصیبوں کے بارے میں آیا کہ وہ قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے ان میں ایک وہ ہے: رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِياً فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ. (بخاری:۱۴۲۳) جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا تو اس کے آنسو بہہ نکلے۔ گویا ''بالغیب'' مَنْ خَشِيَ سے متعلق ہے۔ علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ نے بھی مفردات القرآن میں یہاں غیب سے خلوت وتنہائی ہی مراد لی ہے۔ جیسے بعض حضرات نے ﴿يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ﴾ کے معنی بھی یہی کیے ہیں کہ وہ تنہائیوں میں بھی ایمان لاتے ہیں۔ یعنی ان منافقوں کی طرح نہیں جو اپنے شیاطین سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمھارے ساتھ ہیں اور ہم پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تو ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ (مفردات وغیرہ) اسی طرح آیت ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ﴾ (الملک:۱۲) کے معنی بھی امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہی کیے ہیں کہ جو تنہائی میں اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے لیے بخشش اور بڑا اجر ہے۔ نیز سورۃ الانبیاء میں جو متقین کے بارے میں آیا ہے۔ ﴿الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ﴾ (الانبیاء:۴۹) اسے بھی اور اسی مفہوم کی دیگر آیات کو بھی اسی معنی میں لیتے ہیں۔ بہر حال مراد اللہ کو بن دیکھے یا تنہائیوں میں ہونا مراد ہو دونوں صورتوں میں اللہ سے ڈرنے والے یہاں مراد ہیں۔

﴿بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ﴾ یہ چوتھا وصف ہے۔ منیب، نوب سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا بار بار لوٹ کر آنا۔ شہد کی مکھی کو بھی ''نوب'' اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے چھتا کی طرف بار بار پلٹتی ہے۔ اسی سے إِنَابَةُ إِلَى اللّٰهِ ہے یعنی اخلاص سے اللہ کی طرف لوٹنا۔ گویا قلب منیب کی مثال قطب نما کی ہے وہ جہاں بھی پڑا ہو، اس کی سوئی ہمیشہ قطب ہی کی طرف رخ کرتی ہے، اسے الٹا سیدھا جیسے بھی ہلائیں اس کی سوئی قطب ہی کی طرف پلٹتی

ہے۔اسی طرح ﴿بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ﴾ سے ایسا دل مراد ہے جو ہر طرف سے رخ پھیر کر اللہ وحدہ لاشریک کی طرف پلٹ گیا ہو۔

پہلے جہنمیوں کے بارے میں ان کا ایک بڑا جرم یہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اللہ کے علاوہ اور معبود بنا لیے، مگر ان کے مقابلے میں جنتیوں کے اوصاف میں ہے کہ وہ ہرجائی نہیں ہوتا، بلکہ صرف اللہ ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ آسودگی ہو یا تنگدستی، صحت ہو یا بیماری، آسائش و آرام ہو یا پریشانی و مصیبت، بر و بحر میں ہو یا فضاؤں میں، خوشی ہو یا غمی ہر حال میں وہ اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ علامہ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ قلبِ منیب، قلبِ سلیم کی مانند ہے، اور قلبِ سلیم وہ ہے جو شک اور شرک سے سالم ہے، جو شرک سے بچتا ہے، توحید خالص کو اختیار کرتا ہے اور اللہ کے ماسوا کو چھوڑ کر اللہ ہی کی طرف رجوع کرتا ہے وہ ﴿بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ﴾ ہے۔ بلکہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ قلبِ سلیم تب ہے جب پانچ چیزوں سے بچتا ہے: (۱) شرک سے جو توحید کے متناقض ہے۔ (۲) بدعت سے جو سنت کے مخالف ہے۔ (۳) شہوت سے جو حکم و فرمانبرداری کے مخالف ہے۔ (۴) غفلت سے جو ذکر کے متناقض ہے۔ (۵) ہوا پرستی سے جو تجرید و اخلاص کے منافی ہے۔ (الداء والدواء وغیرہ) حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مومن کا دل صحیح و سلیم اور منیب ہے جبکہ کافر و منافق کا دل تو مریض و مریب ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصاف میں ہے کہ وہ ''منیب'' تھے (ھود: ۷۵) اور ان کا دل قلبِ سلیم تھا (الصّٰفّٰت: ۸۴) یہ قرآن بھی ''عبدِ منیب'' کے لیے بصیرت و نصیحت ہے۔ (سبا: ۹، قٓ: ۸) اسی وصف سے رنگے ہوؤں کے بارے میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ أَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَأَنَابُوْٓا إِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى﴾ (الزمر: ۱۷)

''اور وہ لوگ جنھوں نے طاغوت کی بندگی سے اجتناب کیا اور اللہ کی طرف رجوع کر لیا ان کے لیے خوشخبری ہے۔''

صرف مشکلات و مصائب میں اللہ کی طرف رجوع تو مشرکینِ عرب بھی کرتے

تھے، اللہ تعالیٰ نے ہر حال اور ہر صورت میں اپنی ہی طرف رجوع کا حکم دیا اور اس وصف سے متصفین کو جنت کی بشارت دی۔ مزید (الشوریٰ:۹،۱۰،ھود،۸۸،الروم،۳۱،۳۳) ملاحظہ فرمائیں۔

گویا قلبِ منیب اور قلبِ سلیم وہ ہے جو شرک وشک، معصیت ونافرمانی، دھوکہ اور کینہ، حسد وبغض، تکبر وعناد اور مال وجاہ وغیرہ کی محبت سے صحیح وسالم ہے اور اگر نافرمانی ہو جائے تو جلد اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَقْوَامٌ أَفْئِدَتُهُمْ مِثْلُ أَفْئِدَةِ الطَّيْرِ. (صحیح مسلم:۷۱۶۲)

''جنت میں کچھ لوگ وہ جائیں گے جن کے دل پرندوں کے دل کی مانند ہوں گے۔'' امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس کا مفہوم غالباً یہ ہے کہ جس طرح پرندوں کے دل گناہوں سے اور ہر قسم کے عیب سے پاک اور دنیاوی معاملات سے بے نیاز و بے خبر ہوتے ہیں اسی طرح اہلِ جنت کچھ ایسے ہوں گے جو تمام آلودگیوں سے پاک اور دنیاوی جھمیلوں سے صاف ہوں گے، اصل معاملہ اسی دل کا ہے، جسد اور جسم سنوارنے سے دل نہیں سنورتا۔ نہ اللہ تعالیٰ کسی کی شکل وصورت کو دیکھتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلٰى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ إِنَّمَا يَنْظُرُ إِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (مسلم:۶۵۴۳)

''اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تو تمھارے دلوں اور اعمال کو دیکھتے ہیں۔''

کہ اس کا دل کیسا؟ سینہ کی پلیٹ میں کیا سجا کے لایا ہے؟ اور اعمال میں اخلاص کیسا ہے؟ اسی دل کے بارے میں فرمایا:

إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ. (بخاری:۵۲)

''جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ صحیح تو سارا جسم صحیح اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے خبردار! وہ دل ہے۔''

دل اگر مال و زر کی ہوس میں پھنسا ہوا ہے تو اس کا نتیجہ کساد بازاری، دھوکہ، فریب، دغا، ملاوٹ اور ماپ تول میں کمی بیشی کی صورت میں نکلتا ہے اور حرام وحلال کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ دل اگر اقتدار اور جاہ وجلال میں پھنسا ہوا ہے، تو وہ انسان کو فرعون اور متکبر بنا دیتا ہے اور انسان درندوں سے بھی زیادہ وحشی اور خونخوار بن جاتا ہے، دل اگر ہوس پرستی کا شکار ہے تو انسان کو بے غیرت اور بے حیا بنا دیتا ہے اور اس کا اخلاق تباہ ہو جاتا ہے۔

یوں سمجھیے کہ جسمِ انسانی میں دل کی مثال بادشاہ کی ہے اور جسم کے اعضاء وجوارح اس کی رعایا اور لشکر ہیں، اگر بادشاہ نیک اور صالح ہے تو رعایا بھی نیک ہوگی اور اگر بادشاہ کا عمل وکردار درست نہیں تو رعایا بھی درست نہیں ہوگی۔ مشہور ضرب المثل ہے اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ. لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے دورِ خلافت میں یہ بڑی تبدیلی آئی کہ مجلسوں میں لوگوں کا موضوع ذکر وتذکیر، علم ونوافل اور طاعات بن گیا۔ جہاں بھی چار آدمی بیٹھتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے رات کو تمھارا پڑھنے کا کیا معمول ہے؟ تم نے کتنا قرآنِ مجید یاد کیا، تم قرآنِ مجید کب ختم کرو گے اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھے تھے، جبکہ ولید کے زمانے میں لوگ جمع ہوتے تو عمارتوں اور طرزِ تعمیر کی گفتگو ہوتی، اس لیے کہ ولید کا یہ ذوق تھا۔ سلیمان کھانوں کا بڑا شائق تھا اس کے زمانے میں مجلسوں کا یہی موضوع ہوتا تھا۔ (طبری) مدائن جب فتح ہوا اور مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا، جس میں کسریٰ کا تاج بھی تھا، تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یہ مالِ غنیمت دیکھ کر حیران اور ششدر ہو کر رہ گئے، اس کی بڑی دلچسپ تفصیل البدایہ وغیرہ میں موجود ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اس مال کا خمس جب مدینۂ طیبہ بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئے، اور فرمایا لوگوں نے امانت کا حق ادا کیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: امیر المومنین آپ عفیف ہیں تو آپ کی رعایا بھی عفیف ہے اگر آپ مال ہضم کر جانے والے ہوتے تو آپ کی رعایا بھی ایسی ہوتی۔ (البدایہ: ص ٦٧

ج ۷) بادشاہ کے دل کی درستی ہی انسان کی، بلکہ پورے معاشرے کی اصلاح وفلاح کا باعث ہے۔ انسانوں کی بھلائی کے لیے کتنے ہی انتظام کر لیے جائیں جب تلک دلوں کی اصلاح نہیں ہوگی، ماحول کی درستی اور اصلاح نہیں ہوگی۔ ناسور کو اوپر سے آپ لاکھ مرہم پٹی کریں وہ درست نہیں ہوگا۔ اور مریض شفایاب نہیں ہوگا، ہمارے ماحول کا ناسور بھی دلوں کی خرابی کے باعث ہے، جب تک اس کی چارہ گری نہیں ہوگی حالات نہیں سنوریں گے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے علیم اللسان کو منافق قرار دیا (السلسلة الصحيحة: ۱۰۱۳) اسی طرح زبان سے میٹھے میٹھے بول بولنے والے منافقوں کے بارے میں فرمایا: کہ أَلْسِنَتُهُمْ أَحْلٰى مِنَ السُّكَّرِ وَقُلُوْبُهُمْ قُلُوْبُ الذِّيَابِ. (ترمذی: ۲۴۰۴) ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی مگر دل بھیڑیے کے ہیں یعنی انسانی شکل وصورت میں وہ گویا درندے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَسْتَقِيْمُ إِيْمَانُ عَبْدٍ حَتّٰى يَسْتَقِيْمَ قَلْبُهُ، وَلَا يَسْتَقِيْمُ قَلْبُهُ حَتّٰى يَسْتَقِيْمَ لِسَانُهُ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَأْمَنَ جَارُهُ بَوَائِقَهُ.

(احمد: ۱۳۰۷۹)

"کسی بندے کا ایمان اس وقت تک صحیح نہیں جب تک اس کا دل صحیح نہ ہو، اور اس کا دل اس وقت تک درست نہیں جب تک اس کی زبان درست نہ ہو، اور جب تک اس کا پڑوسی اس کی ایذا سے محفوظ نہیں وہ جنت میں نہیں جائے گا۔"

یعنی دل اگر درست ہے تو اس کے اثرات زبان اور اعضاء پر نمایاں ہونے چاہییں، کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ پڑوسی بھی اس کی ایذا رسانی سے محفوظ رہے، اگر عمل و کردار نہیں بدلا تو سمجھئے دل کا روگ ابھی درست نہیں ہوا، دل کی اسی اہمیت کی بنا پر دل کی درستی اور اس کی استقامت کی اور اس کے زیغ وضلالت محفوظ رہنے کی دعائیں سکھائی گئی ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حق پرستوں کی یہ دعا ذکر کی ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ

رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آلِ عمران:۸)

''اے ہمارے رب! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو نہ پھیر، اور اپنی رحمت ہمیں عطا فرما بے شک تو بڑا دینے والا ہے۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ ''اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آپ یہ دعا کیوں پڑھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کوئی دل ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان نہ ہو، وہ جب چاہتے ہیں اسے حق پر قائم رکھتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اسے حق سے پھیر دیتے ہیں۔ (ابن کثیر:۱۶۴ج۱)

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ لا يستقيم إيمان عبد میں ''ایمان'' سے مراد اعمال ہیں۔ (جامع العلوم والحکم:ص۶۵) قرآنِ مجید میں بھی ''ایمان'' کا اطلاق عمل پر ہوا ہے، چنانچہ تحویلِ قبلہ کے موقع پر سوال اٹھا کہ جو حضرات بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور اسی دوران میں فوت ہو گئے ان کی نمازیں کیا ہوئیں، جس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وما كان الله ليضيع ايمانكم﴾

''اللہ تمھارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا۔ (بخاری:۴۰، ۴۴۸۶ وغیرہ)

لیکن یہاں ''ایمان'' سے ایمانِ قلبی مراد لینا بھی درست ہے۔ منافق ایمان کا اظہار زبان سے کرتے تھے اور کہتے تھے: ﴿نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (المنافقون:۱) ''کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔'' مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ جھوٹ بولتے ہیں ان کا یہ زبانی اقرار معتبر نہیں۔ ان مدعیانِ ایمان نے مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ نے اسے ''مسجد ضرار'' قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ مَنْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الإِيمَانَ إِلٰى قَلْبِهِ (ترمذی:۲۰۳۲ وغیرہ)

''وہ جماعت جو زبان سے اسلام لائی مگر ان کے دلوں تک ایمان نہیں پہنچا۔''

اسی معنی میں اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا:

﴿قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ﴾ الآیۃ (الحجرات:۱۴)

''یہ بدوی کہتے ہیں ہم ایمان لائے، ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

مقصد یہ کہ زبان سے ایمان کا اظہار کافی نہیں، جب تک دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا جائے اور اس کے مقتضیات کا اہتمام نہ کیا جائے۔ اس کے مقابلے میں جن کے دل ایمان سے معمور اور مطمئن ہیں ان کی زبان سے اولاً تو کوئی کلمہ ایمان کے منافی نکلتا ہی نہیں، خواہ کتنے ہی طوفان اٹھیں اور مصائب و آلام کی بھٹیوں میں انھیں جھونک دیا جائے، لیکن اگر کبھی بالجبر ایسا کوئی کلمہ نکل جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں باعثِ ملامت نہیں ٹھہرتا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿مَن كَفَرَ بِاللَّهِ مِن بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ (النحل:۱۰۶)

''جو ایمان لانے کے بعد کفر کرے (وہ اگر) مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو (تب تو خیر ہے۔)''

اس لیے دل میں ایمان ہے تو اس کے ایمان کا اظہار و اعلان درست ہے۔ اور اس کی زبان سے بالاکراہ کلمۂ کفر اس کے ایمان کے منافی نہیں، لیکن اگر دل میں ہی ایمان جاگزیں نہیں تو محض زبان سے اس کا اقرار قابلِ اعتبار نہیں، اسی تناظر میں فرمایا گیا ہے کہ لایستقیم إیمان عبد حتی یستقیم قلبه اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں ایمان کی بہار لگا دے، اس پر استقامت بخشے اور اسی پر موت نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ﴾ (۳۴)

''اس جنت میں داخل ہو جاؤ سلامتی کے ساتھ یہ ہمیشگی کا دن ہے۔''

ان اوصاف سے متصفین کو کہا جائے گا کہ اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، یہاں تمھیں نہ کوئی خوف ہے نہ ہی کوئی خطرہ، نہ رنج وغم ہے نہ ہی فقر وفاقہ، نہ آفات نہ ہی بلیات، نہ ماضی کا پچھتاوا نہ ہی مستقبل کا اندیشہ، پورے اطمینان وسکون سے اس میں داخل ہو جاؤ۔ یہاں یہ بھی کوئی خطرہ نہیں کہ یہ بادشاہی شاید کبھی چھن جائے، نہیں نہیں یہ بادشاہت ہمیشہ کی اور دائمی ہے۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِيْنَ﴾ (الحجر:۴۶) ''اس میں سلامتی کے ساتھ بے خوف وخطر داخل ہو جاؤ۔ یہی گھر سلامتی کا گھر ہے۔'' انسان تو ناپائیدار زندگی کے فریب اور دھوکے میں پھنسا ہوا ہے جبکہ

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ﴾ (یونس:۲۵)

''اللہ تمھیں دار السلام یعنی جنت کی طرف دعوت دیتا ہے۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے صحیح بخاری اور دیگر کتبِ احادیث میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں سویا ہوا تھا جبرائیل علیہ السلام میرے سر کے قریب تھے اور میکائیل علیہ السلام میرے پاؤں کے قریب تھے، ان میں سے ایک نے کہا: کہ تمھارے اس صاحب کی عجیب شان ہے تم اسے بیان کرو، ایک نے کہا: وہ تو سوئے ہوئے ہیں دوسرے نے کہا: ان کی آنکھ سوئی ہے اور دل بیدار ہے، اس نے بیان کیا کہ اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے محل تعمیر کیا، اس میں ایک دستر خوان بچھایا اور دعوت دینے والے کو بھیجا، جس شخص نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا وہ محل میں داخل ہوا اور اس نے دستر خوان سے کھانا تناول کر لیا، اور جس شخص نے دعوت دینے والے کی دعوت کو قبول نہ کیا، نہ وہ محل میں داخل ہوا نہ ہی اس نے دستر خوان سے کھانا کھایا۔ ایک نے کہا: اس مثال کی وضاحت کریں تاکہ یہ صاحب اسے سمجھ پائیں۔ ایک نے کہا: یہ تو نیند میں ہیں، دوسرے نے کہا: ان کی آنکھ سوئی

ہے، مگر دل بیدار ہے۔ چنانچہ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا: محل کا مالک، اللہ ہے۔ محل دار السلام جنت ہے، بلانے والے یہ محمد ﷺ ہیں۔ جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی، محمد ﷺ لوگوں کے مابین فرق ہیں۔ (بخاری: ۷۲۸۱) یعنی مسلمان و کافر، جنتی ودوزخی، حلال وحرام، جائز وناجائز اور معروف ومنکر کا فرق کرنے والے محمد ﷺ ہیں، آپ کی دعوت ہی اب جنت کی دعوت ہے، آپ کا بتلایا ہوا طریقہ ہی جنت کا راستہ ہے، آپ کے بعد تو اب کسی نبی کی اطاعت بھی انسان کے لیے جنت کی ضمانت نہیں۔

حضرت جنید رحمہ اللہ بغدادی فرماتے تھے:

اَلطُّرُقُ كُلُّهَا مَسْدُوْدَةٌ إِلَّا مَنِ اكْتَفٰى بِأَثَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.

تمام راستے بند ہو چکے مگر ایک راستہ، جس نے رسول اللہ ﷺ کے راستہ پر اکتفا کیا۔ یہی راستہ سلامتی کا اور ''دار السلام'' کا راستہ ہے اور اسی کے بارے میں کہا جائے گا کہ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے علاوہ سلامتی اور اطمینان کہیں نہیں ﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (العنکبوت: ۶۴) زندگی تو ہے ہی آخرت کی، جنت کی زندگی۔ دنیا کا کوئی گھر سلامتی کا نہیں، جو خود سلامت رہنے والا نہیں وہ کسی کو کیا سلامتی بخشے گا، دنیا کا تو پہلا لفظ ''دال'' ہی دکھ ودرد کا پیغام ہے۔ رسول اللہ ﷺ غزوۂ احزاب میں خندق کھودتے جاتے ہیں تو یہ رجزیہ شعر پڑھتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ
فَاغْفِرْ لِلْأَنْصَارِ وَالْمُهَاجِرَةِ

اے اللہ! عیش تو آخرت ہی کا عیش ہے، آپ انصار اور مہاجرین کو بخش دیں۔

عیش وعشرت کی زندگی تو صرف جنت کی زندگی ہے، جو ہمیشہ کی ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہے، اسی لیے جنت میں داخلے کے وقت ہی یہ مژدۂ جاں فزا سنا دیا جائے گا ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ﴾ کہ یہ ہے ہمیشگی کا دن، اور ہمیشہ رہنے کی جگہ۔ نہ یہاں بیماری نہ کوئی کوفت، نہ نیند نہ ہی موت، بلکہ اب یہاں موت کو موت آ جائے گی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن

عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے۔ تو موت کو جنت وجہنم کے مابین مینڈھے کی شکل میں لاکر ذبح کردیا جائے گا اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ آج کے بعد کوئی موت نہیں، یہ سن کر اہلِ جنت کی خوشی دوبالا ہو جائے گی، اور جہنمیوں کا حزن وملال بڑھ جائے گا۔

(بخاری: ۶۵۴۴، ۶۵۴۸ وغیرہ)

امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے کہ دنیا میں حکم تھا کہ گھروں میں جاؤ تو السلام علیکم کہہ کر گھروں میں داخل ہو، جنت مومن کا گھر اور آخری منزل ہے، یہاں بھی اپنے اسی حسنِ عمل کا مظاہر کرتے ہوئے، السلام علیکم کہتے ہوئے داخل ہو جاؤ، تمھارا استقبال بھی اسی سے ہوگا اور ہر سو ''سلاماً سلاماً'' کی صدا ہوگی، وہاں کوئی غلط ولغو کلمہ کا تصور ہی نہیں۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ اگر یہ تأویل منقول ہے تو فبہا، تاہم یہ معقول ومناسب تأویل ہے اور دلیل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

﴿لَهُمْ مَّا يَشَآؤُنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ (۳۵)

''ان کے لیے ہوگا جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔''

جنت کی یہ دائمی زندگی ایسی ہوگی جس میں جنتیوں کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہیں گے، جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾

 (حٰمٓ السجدة:۳۱)

''اور تمھارے لیے اس جنت میں ہر وہ چیز ہے جو تمھارا دل چاہے گا، اور تمھارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کروگے۔''

دنیا میں بندہ کو جو کچھ ملتا ہے وہ اللہ کی مشیت پر ملتا ہے اور ہر طلب پر مطلوب حاصل نہیں ہوتا ہے، رزق، صحت، شفا، مال و دولت، اولاد، فتح و نصرت، ملک و حکمرانی، عزت و تکریم غرض یہ کہ دنیا میں یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ وہ چاہے دے، چاہے نہ دے، بندے کے چاہنے پر کچھ موقوف نہیں، ﴿وَمَا تَشَآؤُنَ إِلَّآ أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ﴾ (التکویر:۲۹) ''تمھارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ رب العالمین نہ چاہے۔'' لیکن جنت میں جنتی کے چاہنے اور اس چیز کے واقع ہوجانے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت حائل نہیں ہوگی، جو چاہیں گے ملے گا جو مطالبہ ہوگا پورا کیا جائے گا۔

دنیا میں بندۂ مومن نے اپنی چاہتوں پر عمل نہیں کیا بلکہ ہر معاملے میں اللہ کی چاہت اور حکم کو مقدم جانا، اسی کا نتیجہ ہے اب جنت میں اس کی چاہتوں میں کچھ حائل نہ ہوگا۔ برعکس جہنمی کے کہ اس نے اپنی چاہتوں پر عمل کیا اور اپنے نفس کا بندہ بنا رہا، اس کی اس آوارگی کا قیامت کو یہ نتیجہ نکلا کہ اس کی ہر خواہش اس کی آہ و بکا، اس کی چیخ و پکار بے کار، بلکہ اس کا بول بھی ناگوار، ﴿قَالَ اخْسَؤُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ﴾ (المؤمنون:۱۰۸) ''دور ہوجاؤ میرے سامنے سے اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔''

مگر یہ اہلِ جنت کی شان ہے کہ ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وہ جو چاہیں گے حاضر پائیں گے، اور یوں نہیں کہ جتنا وہ چاہیں گے بس اتنا ہی دیں گے، بلکہ ان کی طلب جتنی بھی ہو بحرِ کرم کا دامن تو اس سے کہیں وسیع تر ہے۔ اس لیے جو مانگیں گے وہ بھی ملے گا اس کے علاوہ ﴿وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ﴾ ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے جو ہم انھیں دیں گے، ''مزید'' کے بارے میں انھیں علم ہی نہیں اس لیے اس کی طلب کیسے؟ ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (السجدۃ:۱۷) ''کوئی بھی نہیں جانتا کہ ان کی آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہم نے کیا کچھ چھپا رکھا ہے۔'' حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری:۳۲۴۴ مسلم۷۱۳۲)

''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا ہے، نہ کبھی کسی کان نے ان کے بارے میں سنا ہے، نہ ہی کبھی کسی انسان کے دل میں ان کا تصور آیا ہے۔''

یہی روایت دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ جب دنیا میں جنت کی بہاروں کا تصور کسی کے حاشیۂ خیال میں نہیں آیا تو اس کے انعام واکرام کا اندازہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''مزید'' سے مراد اہلِ جنت کے لیے جمعہ کے روز اللہ تعالیٰ کی زیارت ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ (یونس:۲۶) ''جنھوں نے اس دنیا میں بھلائی کی، ان کو بھلائی کے عوض جو ملے گا سو ملے گا میری طرف سے اس سے زیادہ بھی ملے گا۔'' اس ''زیادۃ'' سے مراد بھی دیدارِ الٰہی ہے۔ اور اہلِ سنت کا اتفاق ہے جنت میں اہلِ جنت دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوں گے، اس بارے میں متعدد احادیث، کتب احادیث وتفاسیر میں منقول ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے النھایہ (ص ۲۹۸۔۳۰۸ ج ۲) علامہ المنذری رحمہ اللہ نے الترغیب والترہیب (ص ۵۵۱، ۵۵۷ ج ۴) اور علامہ السیوطی رحمہ اللہ نے الدر المنثور (ص ۲۹۰، ۲۹۵ ج ۶) میں انھیں ذکر کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جنت، محلِ دیدارِ محبوب ہے۔ جس محبوب کی محبت میں اس کے بندے آہیں بھرتے ہیں، راتیں قیام، رکوع اور سجود میں گزرتی ہیں۔ مال حتی کہ جان کی قربانی میں وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، جنت میں سب کچھ مل جانے کے بعد اگر محبوب سے ملاقات نہیں تو جنت کیسی؟ کسی نے کیا خوب کہا۔

مَا طَابَتِ الدُّنْيَا إِلَّا بِذِكْرِهِ، وَمَا طَابَةُ الْآخِرَةُ إِلَّا بِعَفْوِهِ وَمَا طَابَتِ الْجَنَّةُ إِلَّا بِرُؤْيَتِهِ . (جامع العلوم والحکم: ۳۸۹)

''دنیا کی کوئی لذت اور خوشی نہیں اگر اللہ کا ذکر نہیں، آخرت میں کوئی خوشی اور لذت نہیں اگر عفو اور معافی نہیں، اور جنت کی کوئی عیش ولذت نہیں اگر اللہ کا دیدار نہیں۔''

ان آیات میں عجیب مطابقت ہے پہلے اہلِ جنت کی تکریم میں قربِ جنت کا ذکر ہے۔ پھر اہلِ جنت کے حسنِ عمل کی تعریف ہے کہ یہ ان اوصاف سے متصف تھے۔ تبھی جنت کے مستحق قرار پائے۔ پھر مزید اکراماً جنت میں ہمیشہ رہنے کی بشارت کے ساتھ سلامتی سے داخل ہونے کا ذکر اور آخرت میں حسبِ منشا عنایتوں کے علاوہ مزید نوازشوں سے نوازنے کی بشارت، جن کا تصور اہلِ جنت کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہوگا۔ اللہ اکبر، وسبحان اللہ۔

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے فرمائے گا: اے جنت والو! کیا تم راضی ہو گئے؟ وہ عرض کریں گے ہم کیوں راضی نہ ہوں جبکہ آپ نے ہمیں وہ نعمتیں عطا کی ہیں جو اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تم کو اس سے بھی افضل چیز عطا کروں گا، وہ عرض کریں گے اے ہمارے رب! ان نعمتوں سے افضل اور کون سی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے اپنی رضا تم پر حلال کر دی، آج کے بعد میں تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ (بخاری: ۶۵۴۹، مسلم: ۲۸۲۹ وغیرہ) یہ جنتیوں پر ایک بڑا انعام ہے۔ غور فرمائیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں تو دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تم پر راضی ہوں، بدریوں کے بارے میں فرمایا: جو چاہو کرو میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ (بخاری: ۳۹۸۳) سبحان اللہ۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ أَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ○ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ○﴾ (۳۶،۳۷)

''اور ہم کتنی قومیں ان سے پہلے ہلاک کر چکے ہیں، وہ ان سے بہت زیادہ طاقت ور تھیں تو انھوں نے زمین کا کونا کونا چھان مارا، کیا وہ کوئی جائے پناہ پا سکے؟ اس میں عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو یا جو کان لگا کر بات سنے اور وہ حاضر ہے۔''

ان آیات میں قریشِ مکہ کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اپنی قوت اور شان وشوکت کے گھمنڈ میں نہ آئیں، ان سے پہلے کتنی قومیں ہو گزری ہیں جو قوت وشوکت میں ان سے زیادہ تھیں، مگر اللہ تعالیٰ کا ان پر عذاب آیا تو وہ ہلاک ہو گئیں اور ان میں جو بچ گئے وہ اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گئے۔

﴿فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ﴾ کے معنی ہیں کہ وہ شہروں میں چل نکلے۔ نَقَّبُوْا ''النقب'' سے ہے جس کے اصل معنی ہیں دیوار یا چمڑے میں سوراخ کرنا۔ اسی سے ''نقب القوم'' ہے یعنی قوم کا چلنا پھرنا، (یعنی گشت کرنا) جبکہ لکڑی میں سوراخ کرنے کو ''ثقب'' کہتے ہیں۔ (مفردات) اور ''محیص'' کے معنی ہیں پناہ گاہ۔ اسی آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے تاج العروس میں علامہ زبیدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

خَرَقُوْا الْبِلَادَ فَسَارُوْا فِيْهَا طَلَبًا لِّلْمَهْرَبِ فَهَلْ كَانَ لَهُمْ مَحِيْصٌ مِنَ الْمَوْتِ. (تاج: ۴۹۲ج۱)

''انھوں نے شہروں کو پھاڑا وہ ان میں جائے پناہ تلاش کرنے کے لیے

چل نکلے تو کیا ان کو موت سے بچنے کے لیے پناہ گاہ مل گئی؟!''

قوموں کی تباہی اور ان کے زوال کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ جب ان پر اللہ کا عذاب آتا تو جو اس عذاب سے بچ جاتے وہ اِدھر اُدھر جان بچانے کے لیے وہاں سے نکل پڑتے تھے۔ ایک دوسرا مفہوم جسے امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے کہ ''نقب فی الأرض'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں میں رزق اور کاروبار کی تلاش میں نکلے، اور تم سے زیادہ وہ شہروں میں گھومے پھرے اور ان شہروں میں انھوں نے اپنے آثار چھوڑے، کیا وہ اللہ کے فیصلے سے بچ سکے اور انکا یہ جاہ وجلال انھیں اللہ کے عذاب سے بچا سکا؟ تم سے ہر لحاظ سے زیادہ شان وشوکت رکھنے والے جب ہماری گرفت سے بچ نہیں پائے تو تمھاری ان کے مقابلے میں حیثیت ہی کیا ہے، امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔ قرآنِ مجید ہی میں ہے۔

﴿أَوَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ كَانُوا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَأَثَارُوا الْأَرْضَ وَعَمَرُوهَا أَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوهَا﴾ (الروم:۹)

''کیا یہ لوگ زمین میں کبھی چلے پھرے نہیں ہیں کہ انھیں ان لوگوں کا انجام نظر آتا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں، وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے، اُنھوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا اور اسے اتنا آباد کیا تھا جتنا اِنھوں نے نہیں کیا۔''

﴿أَثَارُوا الْأَرْضَ﴾ سے مراد زمین کا ادھیڑنا اور پھاڑنا ہے جس میں ہل چلانا اور زمین کھود کر نہریں اور معدنیات نکالنا اور پہاڑ کھود کر گھر بنانا سب شامل ہیں، تعمیر وترقی اس پر مستزاد ہے۔ جب وہ اپنی اس قدر شان وشوکت، قوت وطاقت کے باوجود اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکے تو تمھاری ان کے مقابلے میں حیثیت ہی کیا ہے؟ یہی مفہوم قرآن مجید میں کئی مقام پر بیان ہوا ہے، ملاحظہ ہو: القصص (۷۸) فاطر (۴۴) غافر (۲۱،۸۳) محمد (۱۳)۔

ایک اور مفہوم یہ ہے کہ ﴿فَنَقَّبُوا فِي الْبِلَادِ﴾ سے مراد یہ ہے وہ اپنی شوکت

وسطوت کی بنا پر دوسرے شہروں میں دندناتے ہوئے دور دور تک پہنچے، ملک بملک انھوں نے فساد مچایا اور ان ملکوں میں بھی اپنی سرداری اور حکمرانی کا سکہ چلایا۔ (رازی، آلوسی) لیکن اس کے باوجود کیا وہ ہماری پکڑ سے بچ سکے؟

﴿فَنَقَّبُوْا﴾ ایک قراءت میں ﴿فَنَقِّبُوْا﴾ یعنی بصیغۂ امر ہے اور مفہوم یوں ہے: کہ اے اہلِ مکہ! ان لوگوں کی بستیوں کی طرف چلو، اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ کیا وہ ہمارے عذاب سے بچ سکے۔ ان قوموں کی سرگزشت باعثِ عبرت ہے، بشرطیکہ عبرت حاصل کرنے والا دل ہو اور متوجہ ہو کر سننے والے کان ہوں۔

''قلب'' یعنی دل، ظاہر ہے کہ یہاں بیدار اور صحیح دل مراد ہے، ورنہ ہر انسان کے پہلو میں دل تو دھڑکتا ہے، مگر کچھ دل مریض ہوتے ہیں، کچھ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتے ہیں اور کوئی بات ان پر اثر پذیر نہیں ہوتی، جیسے فرمایا:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا أُولٰٓئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾

(الاعراف:۱۷۹)

''ان کے دل ہیں لیکن ان سے سوچتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔''

یہی بات ایک اور جگہ ارشاد فرمائی ہے:

﴿أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْأَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (الحج:۴۶)

''کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں (کاش کہ) ان کے دل سمجھنے والے ہوتے یا ان کے کان سننے والے ہوتے (تو ان سے عبرت حاصل کر لیتے) حقیقت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں اندھی نہیں، بلکہ وہ دلوں کے اندھے

ہیں جو سینے میں ہیں۔''

قرآنِ مجید نصیحت وعبرت ہے، مگر ان کے لیے جن میں یہ اوصاف پائے جائیں۔

۱۔ بیدار دل، اگر دل زندہ نہیں تو نصیحت اثر نہیں کرے گی یہ پہلی اور بنیادی شرط ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْآنٌ مُّبِينٌ ۝ لِيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا﴾

(یٰس:۶۹، ۷۰)

''یہ تو ایک نصیحت ہے اور قرآن مبین ہے تاکہ ہر اس شخص کو خبردار کر دے جو زندہ ہے۔''

مراد یہاں بھی زندہ دل ہے جو غور و فکر کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(۲) **مائل کان:** اگر دل کی یہ کیفیت نہیں اور اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں تو کم از کم یہ تو ہو کہ اگر اسے کوئی بات سنائے تو توجہ سے اسے سنے اور اس میں یہ طلب صادق ہو کہ کوئی بات سننے سے رہ نہ پائے، پورے انہماک سے اسے سننے والا ہو۔ اگر سننے کا داعیہ ہی نہ ہو تو بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو مؤثر کیوں کر ہوگی؟

(۳) اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ اس کا قلب و ذہن بھی متکلم کے ساتھ ہو اور ''شہید'' حاضر ہو، یعنی وہ حاضر دل و دماغ لیے بیٹھا ہو، غافل اور غائب قلب و ذہن ہوگا تب بھی عبرت حاصل نہیں ہوگی، اگر سننے کے لیے بیٹھا ہو، مگر دل و دماغ حاضر نہیں تو بسا اوقات پاس سے گزرنے والے کا احساس نہیں ہوتا، چہ جائیکہ عبرت و موعظت کی بات کا احساس ہو۔ قریش کو بھی اسی لیے قرآنِ مجید سے عبرت حاصل نہیں ہوئی کہ ان کا دل ہی بیمار، بلکہ مردہ تھا۔ قرآنِ مجید کو توجہ سے اور حاضر دماغی سے سننا تو کجا ان کے سرغنے تو سرے سے قرآنِ مجید سننے سے اجتناب کرتے اور دوسروں کو بھی سننے سے روکتے تھے، چنانچہ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۲۶)

''اور کفر کرنے والوں نے کہا: کہ اس قرآن کو نہ سنو اور اس کے بیچ شور کرو تاکہ تم غالب رہو۔''

بلکہ نضر بن حارث تو فارس سے لونڈیاں اور وہاں کے قصص و کہانیاں خرید کر اسی لیے لایا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن سنائیں تو مقابلے میں مجرے کی محفل سجائی جائے اور لوگوں کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جانے سے مشغول رکھا جائے۔ لہٰذا جب ان کی سرگرمیاں یہ ہیں تو قرآن ان کے لیے باعثِ عبرت کیسے بنتا؟ ان آیات میں جہاں موعظت و نصیحت حاصل کرنے کے کچھ آداب بیان ہوئے ہیں وہاں ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی کا ایک پہلو بھی ہے کہ شب و روز آپ کے قرآن مجید سنانے سے اگر متوقع نتائج نہیں نکل رہے تو اس کے پسِ پردہ یہ اسباب ہیں کہ وہ اسے عبرت کے جذبے سے سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ○ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ○ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ ○﴾ (۳۸ـ۴۰)

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں کچھ تھکان لاحق نہ ہوئی۔ پس جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کریں اور اپنے رب کی تسبیح، اس کی حمد کے ساتھ بیان کرتے رہیں، سورج نکلنے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات میں بھی اور سجدوں سے فارغ ہونے کے بعد بھی اس کی تسبیح بیان کرو۔''

ان آیات میں مزید رسول اللہ ﷺ کو تسلی و تشفی اور صبر و تحمل کی تلقین ہے اور مشرکین کے لیے اثباتِ قیامت کی ایک ضمنی دلیل ہے کہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو بلکہ ان کے مابین سورج، چاند، ستارے، دریا، سمندر، پہاڑ وغیرہ سب کو چھ دن میں پیدا کیا ہے، چھ دن سے چھ ادوار یا اللہ کے ہاں ایام کی جو مقدار ہے وہ مراد ہے، کیونکہ ان کی پیدائش کے وقت تو نظامِ شمسی ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔

اس سے یہی معروف چھ دن بھی مراد ہو سکتے ہیں کہ ان کے پیدا کرنے میں جتنا وقت صرف ہوا وہ ہمارے شمسی نظام کے حساب سے چھ دن کے برابر تھا، جسے اللہ تعالیٰ اپنے علمِ قدیم سے جانتا تھا، جیسے احادیث میں اہلِ جنت کے لیے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا دن جمعہ کا ہے یا جیسے اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے بارے میں ہے کہ جَرَتْ عَلَيْهِمْ أَيَّامُهَا

وَسَاعَاتُهَا. جنتیوں اور جہنمیوں پر دن اور اس کی گھڑیاں گزریں گی، حالانکہ رات دن وہاں نہیں ہوں گے۔ زمانۂ دجال کے بارے میں جیسے فرمایا: ایک دن سال کے برابر ہو جائے گا اور اس میں دنوں کے حساب سے نماز پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ (مسلم: ۷۳۷۳) اسی طرح مراد یہاں بھی دنیا کے دنوں کے حساب سے دن اور گھڑیاں ہیں، اسی طرح اس نظام کے جاری ہونے سے پہلے کے ایام کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

اللہ ﷻ تو اس بات پر قادر ہے جس چیز کو چاہے، ایک لحظہ میں پیدا کر سکتا ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَإِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ (البقرۃ: ۱۱۷)

''آسمانوں اور زمین کو بنانے والا جب کسی چیز کا فیصلہ فرماتا ہے تو حکم دیتا ہے ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔''

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران (۴۷) مریم (۳۵) غافر (۶۸) یٰسٓ (۸۲) میں بھی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ناقۂ صالح علیہ السلام کو اپنے حکم سے پہاڑ کی کوکھ سے پیدا کیا۔ اس کے حکم سے لحظہ بھر میں بگڑے انسانوں کو بندر بنا دیا گیا، زمین کے تختہ کو آن کی آن میں قومِ لوط علیہ السلام پر اُلٹ دیا گیا۔ اس لیے وہ قادرِ مطلق جب چاہے جو چاہے پیدا کرنے پر قادر ہے، مگر زمین و آسمان کے پیدا کرنے میں چھ دنوں کی مدت معاذ اللہ بطورِ عجز نہیں، بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی ومنشا اور حقیقتِ واقعی کا اظہار ہے کہ وہ لمحہ بھر میں بھی بنانے پر قادر تھا، مگر ان کو چھ دنوں میں بنایا، اور اس میں خود انسان کے لیے بڑا سبق ہے کہ جب قادرِ مطلق نے تخلیقِ عالم کی تکمیل چھ دنوں میں کی ہے تو انسان کو اپنی تمام تر ناتوانیوں اور کمزوریوں کے عجلت نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تو کوئی کمی یا کجی نہیں، مگر انسان کا کوئی کام کامل اور مکمل نہیں اسے اپنے امور میں مزید غور وفکر کے لیے وقت نکالنا چاہیے۔ تو یوں چھ دنوں میں اس نظام کو پیدا کرنے میں ہماری تفہیم اور ہماری تربیت کی طرف اشارہ ہے۔ واللہ اعلم

چھ دنوں میں عملِ تخلیق اس بات کا بھی مشعر ہے کہ جس مالک نے اس کے پیدا

کرنے میں اس قدر اہتمام کیا ہے اور اسے ایسا کامل اور خوبصورت بنایا ہے کہ اس میں کہیں کوئی کمی یا کجی محسوس نہیں ہوتی تو یہ کوئی بے مقصد تماشہ نہیں، بلکہ اس کا پیدا کرنا ایک مقصد پر مبنی ہے اور ہر عقلمند اور بصیرت رکھنے والا جب اس پہلو سے غور کرتا ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾

(آل عمران:۱۹۱)

''اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ سب کچھ بے کار اور باطل طور پر نہیں بنایا، آپ پاک ہیں ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا۔''

﴿وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ اس میں دراصل مشرکین کی تردید ہے کہ چھ دنوں میں یہ سب کچھ پیدا کرنے سے ہمیں ذرا بھی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوئی ''مس'' کے معنی چھونا ہے جو ''لمس'' کے ہم معنی ہے، گویا ارشاد ہے کہ تھکان کا ادنیٰ درجہ بھی ہمیں محسوس نہیں ہوا۔ یوں تھکان کی نفی نہیں بلکہ اس کے احساس کی نفی ہے۔ (سبحان اللہ) ہم جس طرح پہلے تازہ دم تھے اسی طرح اب بھی تازہ دم ہیں، اور جب پہلی بار پیدا کرنے سے ہم عاجز نہیں ہوئے اور ہمارے لیے کوئی مشکل پیش نہیں آئی ہے تو کیا دوبارہ پیدا کرنا ہمارے لیے مشکل ہے؟ اگر یہ لوگ آپ کی دعوتِ توحید اور آخرت پر ایمان کا مذاق اُڑاتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کے بارے میں نامناسب باتیں کرتے ہیں، تو آپ ان کی اس بیہودگی پر صبر کریں اور اپنے اللہ کی تسبیح وتحمید اور بندگی میں لگے رہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا کہ اس میں یہودِ مدینہ کی تردید ہے، جو محرف تورات کی بنا پر یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دنوں میں زمین وآسمان بنائے اور ساتویں دن آرام کیا۔'' (قرطبی) چنانچہ بائبل کی کتابِ پیدائش (ب۲:۲) میں ہے کہ آسمان اور زمین کو بنانے کے بعد ''اپنے سارے کام سے جسے وہ کررہا تھا ساتویں دن آرام کیا۔'' مگر مسیحی پادریوں نے بعد میں اسے ''آرام کیا'' کی بجائے ''فارغ'' کردیا۔ بائبل کے عربی ترجمہ میں بھی فَاسْتَرَاحَ فِي الْيَوْمِ السَّابِعِ کے الفاظ ہیں۔ اس کی مزید تفصیل تفہیم القرآن (ص ۱۲۵ ج ۵) میں دیکھئے۔ مگر کیا کیا جائے کہ خروج (ب ۲۰:۱۱) میں بھی یہی ہے کہ

خداوند نے چھ دن میں آسمان اور زمین اور سمندر اور جو کچھ ان میں ہے وہ سب بنایا اور ساتویں دن آرام کیا، بلکہ عہد نامۂ جدید میں عبرانیوں کے نام پولس رسول کا خط کے باب ۴ آیت نمبر ۴ میں ہے: ''خدا نے اپنے سب کاموں کو پورا کر کے ساتویں دن آرام کیا'' اس لیے ''خروج'' میں یہ تحریف چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد کی مصداق ہے۔

تھکاوٹ اور آرام انسان کی کمزوری ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس قسم کے تصور سے پاک ہے۔

یہاں یہ بات بھی دیکھیے کہ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے الثقات (ص ۱۰ ج ۸) میں ذکر کیا ہے کہ ایک شخص نے تین دنوں میں پورا قرآنِ مجید قلم بند کیا تو اس سے پوچھا گیا کہ تم مسلسل لکھتے رہے تمھیں تھکاوٹ نہ ہوئی؟ تو اس نے بڑ ماری اور کہا ﴿مَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ﴾ پھر کیا تھا اللہ تعالیٰ کو غصہ آیا اور اس کا دایاں ہاتھ شل ہو گیا اور اس کے بعد وہ ایک حرف بھی نہ لکھ سکا۔

﴿فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ جو کچھ یہ کہتے ہیں اور جو بیہودہ الزام تراشیاں کرتے ہیں آپ اس پر صبر کریں، اپنے رب کی تسبیح و تحمید سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے کرتے رہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الاحقاف: ۳۵) ''آپ اس طرح صبر کریں جس طرح اولوالعزم انبیاء نے صبر کیا۔'' جس طرح انھوں نے اپنی قوموں کی مخالفت و مزاحمت اور ایذا رسانیوں سے دل برداشتہ ہونے کی بجائے صبر کیا اور ہمت نہیں ہاری، آپ کو بھی انھی کی طرح صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ یہ حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر دیا ہے، ایک جگہ فرمایا: ﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ﴾ (القلم: ۴۸) ''اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو اور مچھلی والے (حضرت یونس علیہ السلام) کی طرح نہ ہو جاؤ'' جس طرح وہ اپنی قوم کے بارے میں بددلی کا شکار ہو کر بلا اذن نکل پڑے تھے، آپ بددلی کا شکار نہ ہوں، بلکہ صبر و تحمل سے اپنے مشن پر ڈٹے رہیں۔ ان کا یہ استہزا اور بدتمیزی آپ کے نماز پڑھنے کے دوران میں بھی ہوتی تھی جیسا کہ عقبہ بن اُبی معیط نے عین نماز کے دوران حرم میں آپ پر اونٹ کی اوجھڑی ڈال دی تھی، آپ کو حکم دیا گیا کہ آپ اس پر صبر کریں اور نماز کا اہتمام جاری رکھیں۔ سورۃ العلق (۹، ۱۹) میں اسی طرف اشارہ

ہے:﴿كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾

یہی حکم ایک اور مقام پر یوں ہے:

﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ آنَآءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى﴾(طٰہٰ:۱۳۰)

''اے میرے نبی! یہ لوگ جو باتیں بناتے ہیں اس پر صبر کرو، اور اپنے رب کی تسبیح وتحمید سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے بیان کرو، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔''

یہی حکم سورۃ الدھر کی آیت (۲۴ تا ۲۶) میں ہے اور سورۃ الطّور میں بھی فرمایا ہے:

﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُo وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾(الطّور:۴۸،۴۹)

''اے میرے نبی! اپنے رب کے فیصلے پر صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو، تم جب اُٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرو، رات کو بھی تسبیح بیان کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔''

''تسبیح'' کے معنی تنزیہ وتقدیس کے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ نافیہ کا اظہار مقصود ہے، جیسے اللہ کا کوئی شریک نہیں، اس کا کوئی بیٹا اور بیوی نہیں، اس جیسا اور کوئی نہیں، اسے نیند کیا اونگھ بھی نہیں آتی، وہ کسی کا محتاج نہیں، انسان جب سبحان اللہ کہتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ سے ان تمام کی نفی کرتا ہے اور اعتراف کرتا ہے کہ اللہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے، یہ شان صرف میرے اللہ کی ہے، اس کے علاوہ مخلوق میں کوئی نہیں جس میں کوئی عیب اور کمزوری نہ ہو اور جو کسی نہ کسی ناطے غیر کا محتاج نہ ہو۔

اور ''حمد'' کہتے ہیں ثنا اور تعریف کو، یعنی اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے متصف قرار دینا

جو اللہ کی شایانِ شان ہیں، یا یہ کہ اللہ کو ان تمام صفات مُثبتہ سے متصف کرنا ہے جو ان کی شان کے لائق ہیں، جیسے اللہ ایک ہے، علیم، رحمان، رحیم، قدیر، خبیر، سمیع، بصیر، غفار، اول وآخر، حکیم، حلیم، حافظ، رب، رزاق، ناصر، غنی، قوی، مالک وغیرہ صفاتِ حسنہ ہیں۔ انسان جب الحمد لله ، اللهم لك الحمد، وله الحمد ، وبحمده کہتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفاتِ کمالیہ حسنہ کا اعتراف واظہار کرتا ہے، یا یوں سمجھئے کہ سبحان اللہ میں لا إله کا اظہار ہے اور وبحمده میں إلا الله کا اقرار ہے۔ یہی نفی واثبات ایمان اور توحید ہے، اور یہی اللہ کو بہت محبوب ہے۔ تسبیح وتحمید کا حکم اللہ نے فرشتوں کو بھی دیا، بلکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کی تسبیح وتحمید میں مصروف ہے ﴿وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ﴾ اسی کا انسانوں کو بھی حکم دیا تاکہ کائنات سے اس کی یگانگت ہو سکے، یہی نفی واثبات کا صحیح عقیدہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان تعلق کا ذریعہ ہے۔ اگر اس میں خلل واقع ہو تو انسان کا اللہ سے تعلق کمزور حتی کہ منقطع ہو جاتا ہے، بلکہ اس سے آگے فکر وعمل میں ایسا بگاڑ پیدا ہوتا ہے، جو دنیا وآخرت میں ذلت ورسوائی کا باعث بنتا ہے۔ فاعتبروا یاأولی الأبصار.

البتہ اللہ کی تسبیح وتحمید سے مراد یہاں نماز ہے۔ کیوں کہ جہاں جہاں بھی قرآنِ مجید میں تسبیح وتحمید کا اوقات کے ساتھ ذکر ہوا ہے وہاں نماز مراد ہے۔ صحیح بخاری (رقم ۵۵۴) وغیرہ میں حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے ہاں پیش کیے جاؤ گے اور تم اللہ کو اسی طرح دیکھو گے جیسے یہ چاند دیکھ رہے ہو۔ اور اس کے دیکھنے میں کوئی شبہ نہیں کرتے، اگر ہو سکے تو آفتاب غروب ہونے اور طلوع ہونے سے پہلے نماز سے عاجز نہ رہو یہ ضرور پڑھو۔ اس کے بعد آپ نے سورۂ ق کی یہی آیت تلاوت فرمائی، جس سے عیاں ہوتا ہے کہ یہاں تسبیح وتحمید سے فجر اور عصر کی نماز مراد ہے۔ اس صریح روایت کے بعد غروب سے پہلے تے، مغرب سے پہلے کی دو رکعتیں مراد لینا درست نہیں، یہ دو رکعتیں غروب کے بہر حال بعد ہیں پہلے نہیں۔ فجر اور عصر کی نمازوں کی خصوصیت کی بنا پر ہی آپ نے فرمایا:

لَنْ يَّلِجَ النَّارَ أَحَدٌ مَنْ صَلَّى قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ

الْغُرُوْب يَعْنِي الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ (مسلم: رقم ۱۴۳۶ عن عمارۃ بن رویبہ)

''وہ شخص ہرگز جہنم میں نہیں جائے گا جو سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے نماز پڑھتا ہے، یعنی فجر اور عصر کی نماز۔''

حضرت فضالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے پانچ نمازوں کی محافظت کا حکم دیا تو میں نے عرض کیا ان اوقات میں میری بڑی مصروفیت ہوتی ہے آپ مجھے کوئی جامع بات بتلائیں کہ میں اس پر عمل کروں تو وہ میرے لیے کافی ہو، آپ نے فرمایا: حَافِظْ عَلَى الْعَصْرَيْنِ تم دو عصروں کی حفاظت کرو، میں نے عرض کیا ''عصرین'' سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: نمازِ فجر اور نمازِ عصر (ابوداود: رقم: ۴۲۸ وغیرہ) یہاں بھی ان دو نمازوں کی اہمیت مقصود ہے اور جماعت کے ساتھ بروقت ادا کرنا مطلوب ہے، یوں نہیں کہ باقی تین نمازوں کی رخصت مل گئی، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے قرآنِ مجید میں ''صلاۃِ وسطیٰ'' یعنی نمازِ عصر کی حفاظت کا حکم ہے، اور غزوۂ احزاب میں کفارِ مکہ کی یورش کی بنا پر وہ قضا ہوگئی تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو آگ سے بھرے، انھوں نے ہماری عصر کی نماز ضائع کر دی۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کی نمازِ عصر ضائع ہوگئی، وقت پر ادا نہیں کی، اس کا تو گھربار اور مال ومتاع سب برباد ہوگیا۔ (بخاری: ۵۵۲، مسلم: ۱۴۱۷) فجر وعصر وہ دو نمازیں ہیں جن میں رات، دن کے فرشتوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی ہے، جب وہ اللہ کے ہاں حاضر ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ لطف وکرم سے پوچھتے ہیں: میرے بندے کیا کر رہے تھے، تو وہ عرض کرتے ہیں جب ہم گئے تھے تو آپ کی عبادت کر رہے تھے اور جب آئے ہیں تب بھی عبادت میں مصروف تھے، اے اللہ! انھیں قیامت کے روز بخش دیجیے۔ (بخاری: ۵۵۵ ومسلم وابن خزیمہ) اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں سے خوب واقف ہے، مگر یہ بھی اس مالک کا کرم ہے کہ فرشتوں کی یہ ڈیوٹی نمازوں کے وقت میں لگائی تاکہ وہ اس کے بندوں کے گواہ بن جائیں اور ان کے حق میں دعائیں کریں۔

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ﴾ یہاں بھی رات کی نمازِ تہجد مراد ہے، جس کا حکم یوں ہے:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ عَسٰٓی اَنْ يَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ (الاسراء: ۷۹)

''اور رات کو نمازِ تہجد ادا کیجیے یہ تمھارے لیے نفلاً ہے توقع ہے کہ تمھارا رب تمھیں مقامِ محمود عطا فرمادے گا۔''

پانچ نمازیں فرض ہونے سے پہلے دو نمازیں فجر اور عصر کی فرض تھیں اور رات کا قیام بھی آپ پر اور اُمت پر ایک سال فرض رہا، پھر اس کے وجوب کا حکم منسوخ ہوگیا اور معراج کی رات سب کے لیے صرف پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا۔ (ابن کثیر)

بعض نے ''وَمِنَ الَّيْلِ'' سے عشاء کی نماز مراد لی ہے، اور بعض نے اس سے مراد وہ تسبیحات لی ہیں جو رات کو بیدار ہونے پر پڑھی جاتی ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص رات بیدار ہونے پر یہ دعا پڑھے اس کی دعا قبول ہوتی ہے اور اگر نماز پڑھے تو نماز قبول ہوتی ہے۔ دعا یہ ہے:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْکَ لَهٗ لَهُ الْمُلْکُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ.

(بخاری: ۱۱۵۴ وغیرہ)

﴿وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ سے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے نماز کے بعد کی تسبیحات مراد لی ہیں۔ جس کی تائید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے، فرماتے ہیں: فقرا مہاجرین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کی کہ اہلِ ثروت تو جنت میں بلند مقام لے گئے، آپ نے فرمایا: کیا مطلب؟ انھوں نے عرض کیا کہ وہ نمازیں پڑھتے ہیں تو ہم بھی نمازیں پڑھتے ہیں، وہ روزہ رکھتے ہیں تو ہم بھی روزہ رکھتے ہیں، مگر وہ صدقہ کرتے ہیں تو ہم فقیر، غریب ہونے کے باعث صدقہ نہیں کرسکتے، وہ اسی طرح غلام آزاد کرتے ہیں ہم یہ نہیں کرسکتے، آپ نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایسے کلمات نہ سکھلاؤں تم اگر ان کا اہتمام کرلو تو تم سے کوئی بھی افضل نہیں ہوگا الا یہ کہ کوئی دوسرا بھی ویسے ہی کرے جیسے تم کروگے۔ تم ہر نماز

کے بعد ۳۳، ۳۳، مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر پڑھا کرو، کچھ ایام بعد پھر حاضر ہو کر انھوں نے عرض کیا کہ ہمارے صاحبِ ثروت ساتھیوں نے اسی طرح کیا جس طرح ہم کرتے، پڑھتے ہیں، تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ (بخاری: رقم ۸۴۳ مسلم وغیرہ) بعض روایات میں ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر کے بعد ایک مرتبہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ پڑھنے کا حکم ہے، اس کے علاوہ بعض اور روایات میں ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھنے کا حکم ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: دو عمل ایسے ہیں جو ان کا اہتمام کرے گا جنت پائے گا، وہ عمل معمولی ہیں، مگر وہ عمل کرنے والے بھی کم ہیں، ہر نماز کے بعد ۱۰، ۱۰ بار سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر، یہ زبان سے پانچوں نمازوں کے بعد ۱۵۰ تسبیحات ہیں، مگر وزنِ میزان میں قیامت کے روز ان کا اجر ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) نیکیوں کے برابر ہوگا۔ اور جب سونے کے لیے بستر پر آئے تو ۳۳، ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، الحمد للہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھے۔ یہ زبان پر ۱۰۰ کلمات ہیں مگر وزنِ میزان میں ایک ہزار ہیں۔ یوں اسے یومیہ اڑھائی ہزار نیکیاں حاصل ہوئیں آپ نے فرمایا: کون ہے جو روزانہ اڑھائی ہزار گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ (ابوداود: ۵۰۶۵، ترمذی: ۴۱۰ وقال حسن صحیح وغیرہ) مگر افسوس آپ کے فرمان کے مطابق نماز کے بعد یہ تسبیحات ۱۰، ۱۰ مرتبہ پڑھنا بھی عنقا ہو گیا ہے، دنیا اور دنیا داری نے ہمیں اتنا مصروف کر دیا کہ اس معمولی ایک منٹ کے عمل پر بھی عمل مشکل ہو گیا ہے۔ فوا اسفا!

احادیثِ مبارکہ میں نماز کے بعد ان تسبیحات کے علاوہ بھی متعدد اذکار و ادعیہ کا ذکر ہے۔ ادعیۂ مسنونہ پر مشتمل بہت سی کتابیں عام دستیاب ہیں۔ ان سے ان ادعیہ کو یاد کر کے ان کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور باقی اوقات میں بھی تسبیحات کو وردِ زبان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح شام ان کے پڑھنے کا حکم فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادتِ مبارکہ بھی یہ تھی کہ آپ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ (ابوداود: ۱۸، ترمذی: ۳۳۸۴) حدیث میں تسبیح و تحمید کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے، اور مختلف الفاظ سے یہ مروی

ہے شائقین الترغیب والترہیب جلد دوم ملاحظہ فرمائیں۔

﴿وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ کے بارے میں حضرت عمر، علی، حسن، ابنِ عباس اور ابو ہریرہ وغیرہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور متعدد تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم سے یہ منقول ہے کہ اس سے مغرب کے بعد کی دو رکعتیں مراد ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر و عصر کے علاوہ باقی ہر نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھتے۔ (احمد، ابوداود: ۱۲۷۶) بلکہ عصر کے بعد بھی جبکہ سورج روشن ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعت پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ (ابوداود: ۱۲۷۴) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی دو رکعتیں گھر میں پڑھتے تھے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ فجر سے پہلے دو رکعتیں پڑھیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ فجر کے لیے تشریف لے گئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابنِ عباس رضی اللہ عنہما! نمازِ فجر سے پہلے دو رکعت نماز ''أَدْبَارُ النُّجُوْمِ'' ہے اور مغرب کے بعد دو رکعتیں ''أدبار السجود'' ہے۔ (ترمذی، حاکم) مگر یہ روایت رشدین بن کریب راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسے غریب کہا ہے۔ (ابنِ کثیر: ص ۲۹۴ ج ۴)

بعض نے ﴿وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ﴾ سے سورج کا سجود مراد لیا ہے اور اس سے ظہر و مغرب کی نمازیں مراد لی ہیں، مگر سورج کا سجود تو ہر لحظہ اور ہر گھڑی ہے۔ سورۃ الحج (۱۸) میں سورج، چاند وغیرہ کے سجدہ کا ذکر ہے اور اس سے مراد ان کا اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جھکنا اور سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔

یہاں دو باتیں مزید غور طلب ہیں، ایک صبر اور دوسری صبر کے ساتھ نماز۔ صبر کے معنی ہیں کسی کو تنگی کی حالت میں روکنا، یا یہ کہ عقل و شریعت دونوں یا ان میں سے کسی ایک کے تقاضا کے مطابق اپنے آپ کو روک لینا صبر ہے۔ یہ عام لفظ ہے جو مختلف مواقع استعمال کے اعتبار سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، چنانچہ کسی مصیبت پر نفس کو روک رکھنا صبر ہے، یہ ''جزع'' کی ضد ہے۔ اور جنگ میں نفس کو روک رکھنا شجاعت ہے اور اس کی ضد ''جبن'' (بزدلی) ہے، یہی صبر اگر پریشان کن حادثہ برداشت کرنے کی صورت میں ہو تو

اسے رحب الصدر (کشادہ دلی) کہتے ہیں جس کی ضد ''ضجر'' ہے۔ اگر کسی بات کو روک رکھے تو اسے ''کتمان'' کہتے ہیں اس کی ضد مَذَلٌ (مجبور ہو کر راز فاش کرنا) ہے۔ قرآنِ مجید میں ان تمام صفات کو صبر کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (مفردات) مزید تفصیل کے لیے علامہ غزالی رحمہ اللہ کی احیاء العلوم (ص ٦٦، ٦٧ ج ٤) اور حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ کی عدۃ الصابرین ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے صبر اور صابرین کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ (البقرۃ: ١٥٣) ''بالیقین اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' نیز فرمایا ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ﴾ (آل عمران: ١٤٦) ''اور اللہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔'' صبر کرنے والوں کے بارے میں فرمایا:

﴿أُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ (البقرۃ: ١٥٧)

''وہی ہیں جن پر ان کے رب کی خاص عنایت اور مہربانی ہے اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

جنت کے حقداروں کا ایک وصف یہ بھی ہے، چنانچہ فرمایا: ﴿وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْراً﴾ (الدھر: ١٢) ''ان کے صبر کے بدلے میں اللہ نے انھیں جنت اور ریشمی لباس عطا فرمایا ہے۔'' بلکہ فرمایا: ﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر: ١٠) ''بالیقین صبر کرنے والوں کو بغیر حساب کے اجر وثواب دیا جائے گا۔'' قرآنِ مجید کی تقریباً ایک سو آیات میں صبر کا مختلف پہلوؤں سے ذکر ہوا ہے، اور احادیث پاک میں بھی صبر کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

صبر کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق بس کسی کی وفات یا جان ومال کے نقصان سے ہے، مگر یہ درست نہیں۔ اہلِ علم نے صبر کی تین قدریں اور قسمیں بیان کی ہیں:

(١) **الصبر علی أقدار الله عز وجل**: یعنی اللہ تعالیٰ کے تقدیری فیصلوں پر صبر، جیسے بیماری، موت، جان ومال وعزت کا نقصان، ناگہانی پریشانی ومصیبت، اپنی اُمیدوں کے پورا ہونے میں ناکامی، فقیری ومسکنت، دشمنوں کی ایذا رسانی، قحط اور خشک

سالی، آفات و بلیات وغیرہ۔ مگر ان حوادث میں طبعی آثار ظاہر ہونا جیسے آنکھوں سے آنسو بہہ پڑنا یا درد کی وجہ سے کراہنا بے صبری نہیں۔

(۲) **الصبر علی الطاعات:** یعنی جن کاموں کے کرنے کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے ان کی پابندی اور اس پر آنے والی تکالیف و نقصانات پر صبر۔ روزہ اور ماہِ رمضان کو احادیث میں اسی لیے صبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) **الصبر عن المحرمات:** یعنی جن سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے روکا ہے ان سے اجتناب اور اس کے نتیجہ میں آنے والی پریشانیوں پر صبر۔ اس لیے صبر صرف اموات و آفات کے موقعہ پر ہی نہیں، تمام اوامر و نواہی کے مطابق اپنے آپ کو روک لینا اور ان کا پابند بنالینا صبر ہے، امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ اور میمون بن مہران رحمہ اللہ وغیرہ نے فرمایا ہے: ان پر صبر اموات وغیرہ پر صبر سے افضل اور اولی ہے کیونکہ اموات و آفات تو اکثر و بیشتر محدود وقت سے متعلق ہیں پھر غم غلط ہو جاتا ہے، مگر اوامر و نواہی کے مطابق اپنے آپ کو روکنا اور خواہشات و شہوات کو کچلنا زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ یہاں اہلِ علم کے ہاں بڑی دلچسپ طویل بحث ہے کہ فقیر صابر افضل ہے یا غنی شاکر، حافظ ابنِ قیم رحمہ اللہ نے اس پر عدۃ الصابرین میں بڑی نفیس بحث کی ہے، یہ اور اسی نوعیت کے دیگر مباحث کے لیے اہلِ ذوق اس کتاب کی اور احیاء العلوم جلد چہارم کی مراجعت فرمائیں۔

دوسری بات، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا، وہ ہے صبر کے ساتھ تسبیح و تحمید اور نماز، قرآنِ مجید میں ہے:

﴿فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِماً أَوْ كَفُوراً ○ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّأَصِيلاً﴾ (الدھر:۲۴، ۲۵)

''اپنے رب کے حکم پر صبر کیجئے اور ان میں سے کسی گنہگار یا کافر کی کوئی بات نہ مانئے اور اپنے رب کا ذکر صبح و شام کیجئے۔''

جب بھی مصیبت آئے تو إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ پڑھنے کا حکم ہے۔ ابھی اوپر گزرا ہے کہ سورۂ طٰہٰ (۱۳۰) اور سورۃ الطّور (۴۸، ۴۹) میں صبر کے ساتھ تسبیح و تحمید اور

نماز کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ﴾ (البقرۃ:۱۵۳)

''اے ایمان والو! اللہ سے مدد چاہو صبر اور نماز کے ساتھ''

یہی بات اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمائی کہ صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ (البقرۃ:۴۵) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے فرمایا تھا: ﴿اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا﴾ (الاعراف:۱۲۸) ''اے میری قوم اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو۔'' یہاں اللہ سے استعانت کا ذکر ہے اور پہلی آیات میں نماز اور صبر کے ذریعے سے اللہ سے مدد طلب کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ نماز ایک بڑا ایجابی پہلو ہے اور استعانت کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور ''صبر'' ایک سلبی کیفیت ہے اور اس میں معاصی سے بچاؤ کا پہلو ہے۔ اور ظاہر ہے معاصی سے اجتناب بھی بہت بڑی عبادت اور اللہ کی محبوبیت و مدد کا سبب ہے۔ گویا نماز سے مأمورات میں سے ایک بڑے عمل کے کرنے اور صبر سے منہیات سے اجتناب کا اشارہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ (ترمذی:۲۳۰۵) ''اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! محرمات کے ارتکاب سے بچو، تم سب سے زیادہ عبادت گزار بن جاؤ گے۔'' ایک جگہ براہِ راست اللہ سے مدد طلب کرنے کا ذکر ہے تو دوسری جگہ مدد کے عملی ذرائع سے اللہ سے مدد طلب کرنے کا ذکر ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم إِذَا حَزَبَهُ أَمْرٌ صَلّٰى (ابوداود:۱۳۱۹)

''کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کوئی مشکل پیش آتی تو نماز پڑھتے۔''

غزوۂ بدر کے دن میدانِ کارزار میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنی جانثاری کے جوہر دکھا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عریش میں دو رکعت نماز پڑھتے ہیں اور دعا و مناجات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مشکل اوقات میں نماز، تسبیح و تحمید، ذکر و دعا یہ اللہ سے گہرے تعلق اور مدد کا بہت بڑا ذریعہ ہیں، بلکہ اللہ سے تعلق اور اس کی عنایت کے بغیر صبر بھی پیدا نہیں ہو سکتا، جیسے فرمایا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ (النحل:۱۲۷) ''اور صبر کیجئے آپ اللہ کی مدد کے بغیر صبر نہیں کر سکتے۔'' اسی لیے یہاں صبر کے ساتھ نماز اور تسبیح و تحمید کا حکم ہے۔

﴿وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيبٍ ○ يَوْمَ يَسْمَعُونَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوجِ ○ إِنَّا نَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَإِلَيْنَا الْمَصِيرُ ○ يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ذَٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ﴾

(۴۱۔۴۴)

''اور سننے کے لیے کان لگائے رکھو جس دن منادی کرنے والا قریب سے پکارے گا، جس دن سنیں گے چیخ (صور کی آواز) کو ٹھیک طور پر، وہ دن (قبروں سے) نکلنے کا ہے، ہم ہی زندہ کرتے اور ہم ہی مارتے ہیں اور ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، اس دن ان کے اوپر سے زمین پھٹ جائے گی اور وہ تیز تیز جائیں گے یہ حشر ہمارے لیے آسان ہے۔''

پہلی آیات میں حکم تھا کہ آپ کفار کی باتوں پر صبر کریں، نمازیں پڑھیں اور تسبیح وتحمید میں مشغول رہیں، اب فرمایا: کہ اسی کے ساتھ ساتھ آپ قیامت کا انتظار کریں جو ایک حقیقت واقعی ہے، اس دن اس کے انکار کی حقیقت منکشف ہو جائے گی۔

﴿اسْتَمِعْ﴾ کے معنی آواز کو سننے کے لیے کان لگانے کے ہیں، جس میں اشارہ ہے کہ یہ بالکل قریب ہے جسے کفار رَجْعٌ بَعِيدٌ اور ﴿إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا﴾ (المعارج:۷) ناممکن سمجھتے ہیں، مگر ہم اسے قریب قرار دیتے ہیں کہ یہ تو قریب ہے اور ہونے ہی والی ہے اور یہ ہوگی بھی، ﴿تاتيهم بغتة﴾ اچانک اس لیے اس کی تیاری کریں اور اس آوازۂ حق کو سننے کے لیے کان لگائے رکھیں۔

یا یہ کہ اے نبی! میرا حکم یا فیصلہ کان لگا کر سنیں، اور وہ ہے جس کی تفصیل بعد کی

آیات میں ہے، یعنی یہ تو انکار کرتے ہیں، مگر آپ میری بات سنیں کہ یہ ایک شدنی حقیقت ہے، اس دن منادی کرنے والا قریب سے ندا کرے گا، جو شخص جہاں کہیں ہوگا وہاں اسے اس منادی کی آواز ایسے سنائی دے گی کہ کوئی قریب سے آواز دے رہا ہے، مشرق ومغرب، شمال وجنوب ہر جانب پورے کرۂ ارض میں پڑے ہوئے انسانوں کو یہ آواز یکساں سنائی دے گی، یوں نہیں کہ کسی کو آہستہ اور کسی کو اونچی سنائی دے، یہ آواز الصیحة بڑی بلند چیخ اور چنگھاڑ ہوگی۔ اسی کو دوسری جگہ ﴿الصَّاخَّةُ﴾ کہا گیا ہے۔ (عبس: ۳۳) یعنی سخت اور کرخت آواز۔ اور ایک مقام پر ﴿زَجْرَةٌ﴾ کہا گیا ہے۔ (النازعات: ۱۳) ڈانٹ، جو قرن میں پھونکی جائے گی۔ اس سے معنوی اعتبار سے بھی ان آثار کی نفی اور عدمِ صحت معلوم ہوتی ہے جن میں آیا ہے کہ فرشتہ بیت المقدس کے صخرہ پر کھڑا ہو کر کہے گا:

يَا أَيَّتُهَا الْعِظَامُ النَّخِرَةُ وَالْجُلُوْدُ الْمُتَمَزِّقَةُ، وَالْأَشْعَارُ الْمُتَقَطَّعَةُ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكَ أَنْ تَجْتَمِعِيْ لِفَصْلِ الْحِسَابِ.

(الدرالمنثور: ص۱۱۰ ج۶ وغیرہ)

"اے گلی سڑی ہڈیو، اور ریزہ ریزہ ہونے والے چمڑو، اور بکھرنے والے بالو، اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ حساب کے لیے جمع ہو جاؤ۔"

اسی قسم کا ایک قول کعب الاحبار سے بھی ہے، مگر ان کی اسانید محلِ نظر ہیں۔

یہ ﴿الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ﴾ آواز ٹھیک طور پر سنیں گے،، یعنی یہ آواز یقینی طور پر سنیں گے اور انھیں قیامت کے ہونے پر کوئی اشتباہ نہیں رہے گا، جس کے بارے میں وہ پہلے شک میں مبتلا تھے اب اسے ایک حقیقت پائیں گے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے وہ حق، یعنی قیامت کی آواز سنیں گے جو ایک امرِ حق ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ آواز سنیں گے جس کے ساتھ قیامت ملی ہوئی ہوگی: أيْ مُقْتَرَنَةً بِالْحَق یعنی وہ نفخہ سن لیا بس اب آئی قیامت۔ (رازی)

اور یہ ہے زمین سے نکلنے کا دن، جہاں جہاں انسان زمین میں دفن ہوں گے اور جہاں جہاں ان کے اعضاء واجزا ہوں گے وہیں سے زمین سے باہر نکل آئیں گے۔

﴿إِنَّا نَحْنُ نُحْيِيْ وَنُمِيتُ﴾ ہم ہی زندہ کرنے اور مارنے والے ہیں، نہ زندہ کرنے میں کسی کا ہاتھ ہے نہ مارنے میں، بلکہ شکمِ مادر سے جس طرح اندامِ نہانی کے راستے انسان کا خروج وظہور ہم کرتے ہیں، بالکل زمین سے اس کا خروج بھی اسی طرح ہو گا۔ یہ سارا نظام ہمارے ہاتھ میں ہے، اور بالآخر ہمارے ہی پاس انسان نے لوٹنا اور پلٹنا ہے، عدالت ہماری ہوگی اور فیصلے بھی ہمارے ہوں گے۔ جب زندگی وموت میں کوئی ہمارا شریک نہیں تو ہمارے فیصلوں میں بھی کوئی شریک نہیں، بلکہ وہاں وہی بات کرے گا جسے ہم اجازت دیں گے، لہٰذا کسی کی دخل اندازی کا سوال ہی کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔

﴿يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ﴾ نفخۂ صور کے نتیجہ میں اب قبروں سے نکلنے کی کیفیت کا بیان ہے کہ اس روز زمین پھٹے گی تو وہ قبروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے جا رہے ہوں گے، جیسے سورۃ المعارج میں ہے:

﴿يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعاً كَأَنَّهُمْ إِلٰى نُصُبٍ يُوفِضُوْنَ﴾ (المعارج:۴۳)

''اس روز قبروں سے نکل کر دوڑیں گے جیسے وہ اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہوں۔''

اسی طرح ایک اور مقام پر ہے:

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ﴾ (یٰس:۵۱)

''اور صور میں پھونکا جائے گا تو وہ قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑیں گے۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْأَجْدَاثِ كَأَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝ مُّهْطِعِيْنَ إِلَى الدَّاعِ يَقُوْلُ الْكَافِرُوْنَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ﴾ (القمر:۷،۸)

''وہ اپنی قبروں سے نکلیں گے جیسے بکھری ہوئی ٹڈیاں ہوں، دوڑتے

جائیں گے پکارنے والے کی طرف اور کہیں گے یہ دن بڑا مشکل ہے۔"

ان آیات میں ظاہر ہے کہ قبروں سے نکل کر میدانِ محشر میں جلدی اور تیزی سے جانے کا ذکر ہے، مگر سورۂ قٓ کی آیت سے بعض نے قبروں سے جلدی نکلنے کا مفہوم بھی لیا ہے کہ وہ قبروں سے جلد نکلیں گے، قبروں سے نکلنے میں دیر نہیں ہوگی، جلدی سے نکلیں گے اور تیز تیز میدانِ محشر کی طرف چل پڑیں گے۔

﴿ذٰلِكَ حَشْرٌ﴾ یہ حشر ہمارے لیے آسان ہے۔ یہ ان کی تردید ہے جو اسے ناممکن اور بعید از عقل سمجھتے تھے، کہ تم اگر چہ اسے مشکل سمجھتے ہو، مگر ہمارے نزدیک یہ سارا کام چٹکی میں ہو جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قبر سے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ اٹھیں گے۔ قبروں سے سبھی ننگے بدن، بے ختنہ اٹھیں گے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ (بخاری: ۳۳۴۹) پھر رسول اللہ ﷺ کو لباس پہنایا جائے گا۔ (ابن ابی شیبہ: ص ۱۱۷ ج ۱۴) ہر انسان اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس حالت میں وہ مرا ہے، اگر کوئی راہِ جہاد میں زخمی ہوگا تو قیامت کے روز اسی حالت میں آئے گا کہ خون بہہ رہا ہوگا۔ اس کا رنگ خون کا ہوگا مگر خوشبو مشک کی آرہی ہوگی۔ (بخاری) ایک صحابی رضی اللہ عنہ احرام کی حالت میں اونٹنی سے گر کر جاں بحق ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: اسے بیری کے پتوں کے پانی سے غسل دو۔ انھیں کپڑوں میں دفن کرو، نہ اسے خوشبو لگاؤ نہ ہی اس کا سر ڈھانپو قیامت کے دن یہ تلبیہ کہتا ہوا اٹھے گا۔ (بخاری رقم: ۱۸۵۱) اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنی رضا کا کام کرتے ہوئے موت نصیب فرمائیں۔ (آمین)

﴿نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ﴾

(۴۵)

''ہم خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ کہتے ہیں، اور آپ ان پر کوئی داروغہ نہیں ہیں، بس آپ انھیں اس قرآن سے نصیحت و یاد دہانی کریں جو وعید سے ڈرتے ہیں۔''

اس آیتِ مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تسلی و تشفی ہے کہ قیامت کے نہ آنے کے حوالے سے یا آپ کو رسول بنائے جانے کے حوالے سے جو کچھ بھی یہ کہتے ہیں ہم اسے بتمام وکمال جانتے ہیں، آپ صبر کریں اور ان کا معاملہ ہمارے سپرد کر دیں۔ آپ ان پر جبر کرنے والے نہیں بھیجے گئے کہ آپ سے ان کے بارے میں کوئی سوال ہوگا کہ یہ ایمان کیوں نہیں لائے؟

''الجبر'' کے معنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ الجبر، انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی تعلّی اور سرکشی ہے، جیسے فرمایا: ﴿وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ﴾ ''ہر سرکش ضدی نامراد ہوا۔'' یا جیسے فرمایا: ﴿وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّاراً شَقِيّاً﴾ (مریم:۳۲) ''مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔'' اور کبھی دوسرے پر استبداد کرنے والے کو ''جبار'' کہا جاتا ہے اور یہاں یہ اسی معنی میں ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ﴾

(الغاشیہ:۲۱،۲۲)

''آپ نصیحت کریں، آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں، ان پر جبر کرنے والے نہیں۔''

اسی طرح فرمایا:

﴿وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ﴾ (المؤمن:۲۹)

''میں تو تمھیں صرف نیکی کی راہ بتلاتا ہوں:

رہا نیک بنا دینا تو یہ میرے اختیار میں نہیں یہ صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دینے پر قادر ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾ (یونس:۹۹)

''کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے تا کہ وہ مومن ہو جائیں''

یہاں جیسے آپ کے بارے میں وضاحت ہے کہ آپ کو کوئی داروغہ نہیں بنایا کہ کسی کو بالجبر ایمان کا کہیں، بلکہ آپ کی ذمہ داری نصیحت کی ہے اور وہ آپ بتمام ادا کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں کفار کو بھی خبردار کیا گیا ہے کہ جہاں تلک معاملہ حجت ودلیل سے بات سمجھانے کا ہے وہ تو ہمارے نبی نے یہ ذمہ داری پوری کر دی ان کا کام زبردستی مؤمن بنانا نہیں، اگر بالجبر ایمان دار بنانا مقصود ہوتا تو اس کے لیے نبی کی ضرورت ہی کیا تھی یہ کام مجھ (اللہ) سے بہتر طور پر کون کر سکتا ہے؟ اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو ہم خود تم سے نمٹ لیں گے۔ ﴿فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ﴾ (الرعد:۴۰) ''آپ بس ان تک بات پہنچائیں ہم خود حساب لے لیں گے۔''

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ﴾ جو وعید سے ڈرتا ہے آپ اسے قرآن سے ڈرائیں، سمجھائیں۔ ''وعید'' سے عذاب مراد ہے کہ جو اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے آپ اسے نصیحت کریں، جیسے ایک اور جگہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ (فاطر:۱۸)

''آپ صرف ان کو ڈرائیں، متنبہ کریں جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔''

جن کے دلوں میں اللہ کا ڈر ہے وہی راہِ راست پر آئیں گے۔ جیسے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿إِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ﴾ (یٰس:۱۱)

''آپ اسی کو خبردار کر سکتے ہیں جو نصیحت کی پیروی کرے اور بن دیکھے

رحمان سے ڈرے۔"

اسی طرح ایک مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّمَا أَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَخْشَاهَا ﴾ (النازعات: ۴۵) آپ تو صرف اسے ڈرانے والے ہیں جو اس (قیامت) سے خوف کرے۔" یہاں یہ بات پیشِ نگاہ رہے کہ رسول اللہ ﷺ تو تمام کے لیے نذیر تھے، جیسا کہ فرمایا:

﴿تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ﴾ (الفرقان: ۱)

"بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان کو نازل کیا تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے نذیر ہو۔"

بلکہ ابتدائی حکم بھی عام تھا ﴿ يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ﴾ (المدثر: ۱، ۲) "اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو۔" اس انذار میں سبھی شامل ہیں اور مومن اس سے مستفید ہوتے ہیں، جبکہ وہ انذار جس میں عذاب اور نافرمانی کے نتیجہ میں سزا کا ذکر ہے تو یہ کفار کے لیے خاص ہے، جیسے فرمایا: ﴿ إِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنْذِرَ بِهِ قَوْمًا لُدًّا ﴾ (مریم: ۹۷) "بے شک ہم نے اس کلام کو آسان کر کے آپ کی زبان پر اس لیے نازل کیا کہ آپ پرہیز گاروں کو خوشخبری دیں اور ہٹ دھرموں کو ڈرائیں۔" یا جیسے فرمایا: ﴿لِتُنْذِرَ بِهِ وَذِكْرَى لِلْمُؤْمِنِينَ ﴾ (الأعراف: ۲) "تاکہ آپ اس قرآن کے ذریعے سے ڈرائیں اور مومنوں کو نصیحت کریں۔" گویا مومنوں کے لیے یہ بشارت اور نصیحت ہے اور کافروں کو خبردار کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور جن آیات میں اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے انذار کا ذکر ہے تو یہ ایک حقیقتِ واقعی کا اظہار ہے۔ قرآن مجید کی ابتدا ہی میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ﴿ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ ﴾ "یہ وہ کتاب جس میں کوئی شک نہیں، متقین کے لیے یہ ہدایت ہے۔" ظاہر ہے کہ جو پرہیز ہی نہیں کرتا اس کے لیے کوئی نسخۂ شافی شفا بخش نہیں ہو سکتا، لہٰذا جو اللہ سے اور اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں وہی اس سے فیضیاب ہوتے ہیں، انھی کو آپ قرآن مجید سے

نصیحت کریں۔ جن کو قرآنِ مجید سے روشنی اور سبق حاصل نہیں ہوتا وہ کسی اور سے بھی سبق کیا لیں گے۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ جس نے اس سے ہٹ کر کسی اور سے سبق سیکھا وہ پگڈنڈیوں میں اُلجھتا اور خرافات میں پھنستا چلا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تیئیس سالہ دورِ نبوت میں جن پہلوؤں سے نصیحت و تربیت کی وہ بہر نوع قرآنِ مجید سے ہی نصیحت ہے کیونکہ آپ قرآنِ مجید کے مبلغ اور مبین و مفسر بھی ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کے بارے میں منقول ہے کہ جب وہ یہ آیت تلاوت فرماتے تو یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ یَّخَافُ وَعِیْدَکَ وَیَرْجُوْا مَوْعُوْدَکَ یَابَارُّ، یَارَحِیْمُ!

”اے اللہ! ہمیں ان لوگوں میں داخل فرما جو آپ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور آپ کے وعدے کی اُمید رکھتے ہیں، اے وعدہ پورا کرنے والے! اے رحم کرنے والے!“

اس آیت کا یہ مفہوم تو قطعاً نہیں کہ قرآنِ مجید کے علاوہ اور کوئی ذریعہ موعظت و نصیحت نہیں، اور نہ ہی اس سے قرآنِ مجید کے علاوہ عبرت و نصیحت کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآنِ مجید ہی میں حکم ہے: ﴿وَذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ﴾ (ابراہیم: ۵) ”کہ انھیں ایام اللہ کے ذریعے سے نصیحت کریں۔“ ”ایام اللہ“ سے مراد جیسا کہ حضرت ابن عباس اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم وغیرہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں اور تاریخ کے سبق آموز واقعات ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی امم سابقہ کے واقعات بیان فرمائے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے ذریعے سے سبق آموز باتیں بتلائیں، کتب احادیث میں ان واقعات کا تذکرہ موجود ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ تو اُمت کے لیے اسوۂ حسنہ ہے ہی، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سوانح اور انکی زندگی کے ایمان افروز واقعات بھی ”ایام اللہ“ میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھی کے بارے میں فرمایا ہے کہ ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبۃ: ۱۰۰) ”اور جو ان کی پیروی اخلاص

نیت سے کرتے ہیں اللہ ان پر راضی اور وہ اللہ پر راضی۔'' اسی طرح اُمت کے ائمۂ ہدی اور ان صلحاء کا تذکرہ اور تاریخ کے سبق آموز واقعات بھی ایمان کو جلا بخشنے اور نصیحت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، امام سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عِنْدَ ذِكْرِ الصَّالِحِيْنَ تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ (الاعلان بالتوبیخ: ص۶۱ وغیرہ) ''کہ صالحین کے ذکر پر اللہ کی رحمت نازل ہوتی ہے۔'' حافظ ابنِ عبدالبر نے یہی قول امام سفیان ثوری کی طرف منسوب کیا ہے۔
(جامع بیان العلم: ص۱۶۲ ج۲)

بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ اللہ کے ذکر سے رضوان نازل ہوتی ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ ہو تو محبت نازل ہوتی ہے اور جب صالحین کا ذکر ہو تو رحمت نازل ہوتی ہے۔ (الاعلان: ص۵۴)

حافظ سخاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے سلف کی ایک جماعت نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ ''کہ ذکر اللہ سے دلوں کے اطمینان ملتا ہے۔'' سے مراد صحابۂ کرام کا تذکرہ واحوال ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے الدرالمنثور (ص ۵۸ ج۴) میں امام مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام کا ذکر مراد ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ علمائے کرام کی حکایات اور ان کے محاسن کا تذکرہ میرے نزدیک بہت سے فقہی مسائل سے بہتر ہے۔ (الاعلان، الجامع) اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پہلے انبیائے کرام اور ان کی امتوں کے واقعات کو باعثِ عبرت وموعظت قرار دیا ہے۔ (یوسف: ۱۱۱) اور انبیاء علیہم السلام کے تذکرہ کو دل کی مضبوطی اور ثابت قدم رہنے کا باعث بتلایا ہے۔ (ھود: ۱۲۰) اسی بنا پر بعض نے فرمایا ہے کہ حکایات، اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں کو پختہ کرتے ہیں، بلکہ تاریخ کے ان واقعات وحکایات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات بھی ہیں، اور صحبتِ صالحین سے محرومی کا مداوا بھی ہے، بشرطیکہ وہ صحت سے ثابت ہوں، اس حوالے سے وضعی اور بناوٹی قصے اور داستانیں الٹا ایمان ویقین کی کمزوری کا باعث بنتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صالحین کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، اگر یہ صحبت میسر نہ ہو تو ان کے عملی تذکرے اور

مجاہدے اور دین کی طلب وتڑپ میں ان کی مساعی کا ذکر بھی یقیناً تسکین واطمینان کا باعث اور ایمان وعمل کی ترقی کا سبب ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں سلف صالحین کے نقشِ قدم پر دین حق پر استقامت عطا فرمائے، قرآنِ مجید کو ہمارے دلوں کی بہار اور ہموم وغموم سے نجات کا ذریعہ بنائے، جنت الفردوس میں اپنے حبیب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پاک باز صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی رفاقت نصیب فرمائے۔ اور اس حقیری خدمت کو قبول کر کے میری اور میرے والدین، مشائخ اور اولاد واقرباء کی بخشش ومغفرت کا سبب بنادے۔ آمین۔

ارشاد الحق اثری

۲۰ ذوالحجۃ ۱۴۲۸ھ

بروز بدھ ۲ جنوری ۲۰۰۸ء
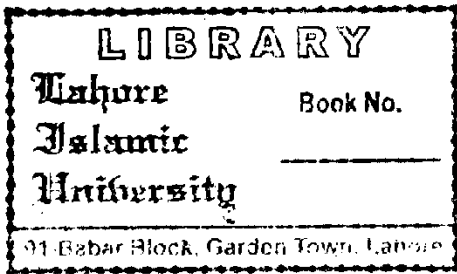
ادارہ کی دیگر مطبوعات

1 العلل المتناهية في الأحاديث الواهية (2 جلدیں)

2 إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر للمحدث شمس الحق الديانوي رحمه الله

3 المسند للإمام أبي يعلى أحمد بن علي بن المثنى الموصلي رحمه الله (چھ ضخیم جلدوں میں)

4 المعجم للإمام أبي يعلى الموصلي رحمه الله

5 مسند السراج، للإمام أبي العباس محمد بن إسحق السراج الثقفي النيسابوري

6 المقالة الحسنى (المعربة) للمحدث عبدالرحمن المباركفوري رحمه الله

7 جلاء العينين في تخريج روايات البخاري في جزء رفع اليدين (للشيخ الأستاذ بديع الدين شاه الراشدي رحمه الله)

8 فضائل شهر رجب لأبي محمد الحسن بن محمد الخلال رحمه الله (عربی)

9 تبيين العجب ...... في فضل رجب للحافظ ابن حجر العسقلاني رحمه الله

10 إمام دارقطني رحمه الله

11 صحاح ستہ اور ان کے مؤلفین

12 موضوع حدیث اور اس کے مراجع

13 عدالت صحابہ رضی اللہ عنہم

14 کتابت حدیث تا عہد تابعین

15 الناسخ والمنسوخ

16 احکام الجنائز

17 امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ

18 قادیانی کافر کیوں؟

19 پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری نماز

20 مسئلہ قربانی اور پرویز

21 پاک وہند میں علمائے اہلحدیث کی خدمات حدیث

22 توضيح الكلام في وجوب القراءة خلف الإمام (جو کہ مباحث اپنے موضوع پر انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے)

23 احادیث ہدایہ: فنی وتحقیقی حیثیت

24 آفات نظر اور ان کا علاج

25 مولانا سرفراز صفدر اپنی تصانیف کے آئینہ میں

26 آئینہ ان کو دکھایا تو برا مان گئے

27 احادیث صحیح بخاری ومسلم میں پرویزی تشکیک کا علمی محاسبہ

28 امام بخاری رحمہ اللہ پر بعض اعتراضات کا جائزہ

29 حرز المؤمن

30 مسلک اہلحدیث اور تحریکات جدیدہ

31 اسباب اختلاف الفقہاء

32 مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور سلف کا موقف

33 مسلک احناف اور مولانا عبدالحی لکھنوی

34 فلاح کی راہیں

35 مقالات 1-2

36 اسلام اور موسیقی

37 اسلام اور موسیقی پر اشراق کے اعتراضات کا جائزہ

38 أحكام الحج والعمرة والزيارة

39 نوافل کی جماعت کے ساتھ فرض نماز کا حکم

40 تنقيح الكلام في تائيد توضيح الكلام

41 مقالات محدث مبارکپوری رحمہ اللہ (صاحب تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی)

42 تفسیر سورۃ ق

ادارۃ العلوم الاثریہ منٹگمری بازار

فیصل آباد —— فون: 041-2642724